جاوید احمد غامدی

قرآن اور اسیران جنگ

اسیران جنگ کے بارے میں قرآن کا جو حکم ہم نے اپنی کتاب ''میزان'' میں بیان کیا ہے، اُس کا ماخذ سورۂ محمد (۴۷) کی آیت ۴ ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی کا نقطۂ نظر اِس معاملے میں مختلف محسوس ہوتا ہے۔ اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اِس کی تقریر اُنھوں نے جس طرح فرمائی ہے، اُس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ متکلم کا منشا یہاں جنگی قیدیوں سے متعلق کوئی قانون بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ اگر کافروں سے جنگ کی نوبت آ جائے تو اُن سے مرعوب نہ ہوں، وہ بالکل بے بنیاد اور بے ثبات ہیں، لہٰذا اچھی طرح خوں ریزی کر کے اُن کے کس بل نکال دیں، پھر بھی بچ جائیں تو اُنھیں بھاگنے نہ دیں، بلکہ قیدی بنائیں اور اِس طرح باندھ لیں کہ اِس کے بعد اگر وہ رہائی پائیں تو مسلمانوں کے احسان مند ہو کر یا اُنھیں فدیہ دے کر ہی رہائی پائیں۔

یہ تفسیر متاثر کرتی ہے۔ سورہ میں جن لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے، وہ رسول کے منکرین ہیں اور اتمام حجت کے بعد عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں۔ اُن کے بارے میں اگر یہ کہا جائے کہ اُن کا اچھی طرح قلع قمع کرو، اُنھیں بھاگنے نہ دو، بلکہ مضبوط باندھو اور مرہون احسان بنائے بغیر یا فدیہ لیے بغیر رہا نہ کرو تو بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ کلام ہر لحاظ سے سورہ کے مطالب کے ساتھ ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ لیکن تدبر کا فیصلہ یہ نہیں ہے۔ اُس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کے الفاظ اِس تفسیر کو قبول نہیں کرتے۔ یہی بات کہنا مقصود ہوتی تو الفاظ غالباً یہ ہوتے کہ 'فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب، ثم اذا اثخنتموھم فشد الوثاق'، مگر الفاظ یہ نہیں ہیں، بلکہ یہ ہیں کہ 'حَتّٰٓی اِذَآ اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ'۔ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں فعل مصدر منصوب

کی صورت میں ہے اور 'شُدُّوا الْوَثَاقَ' میں سادہ امر کی صورت میں جو قرینہ موجود ہو تو ترغیب، تلقین، وجوب، دعوت، یہاں تک کہ محض جواز اور اباحت کے لیے بھی آجاتا ہے۔ پھر 'ثُمَّ' کے بجائے 'حَتّٰی' ہے جو غایت امر پر دلالت کرتا ہے۔ یہ تبدیلی اِسی لیے ہے کہ متکلم کے پیش نظر یہاں وہ مضمون نہیں ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں ہے۔ لہٰذا گردنیں مارنے کے بعد یہ قیدی پکڑنے کی تلقین نہیں ہے، جس طرح کہ استاذ امام نے سمجھا ہے، بلکہ اُسی حکم کی تکمیل اور اُس سے متعلق ایک تنبیہ ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں دیا گیا ہے۔ قیدی اُس زمانے میں من جملہ غنائم تھے۔ اُنھیں پکڑنے کے لیے اہل عرب کی فطری رغبت کے پیش نظر فرمایا ہے کہ یہ کام اُس وقت ہونا چاہیے، جب اِن منکرین حق کو بالکل کچل دیا جائے۔ چنانچہ مدعا یہ نہیں ہے کہ پہلا کام گردنیں مارنا اور دوسرا قیدی بنانا ہے جس میں رورعایت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ یہ ہے کہ جنگ کی نوبت آجائے تو کرنے کا ایک ہی کام ہے اور وہ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' ہے، اُس کا حق ادا ہونا چاہیے۔ وہ جب آخری درجے میں ادا ہو جائے، تب قیدی پکڑے جا سکتے ہیں۔ صاحب ''تفہیم القرآن'' نے اِسی بنا پر آیت کا ترجمہ اِس طرح کیا ہے:

> ''پس جب اِن کافروں سے تمھاری مڈ بھیڑ ہو تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے، یہاں تک کہ جب تم اِن کو اچھی طرح کچل دو، تب قیدیوں کو مضبوط باندھو۔'' (۵/۱۱)

اب آگے دیکھیے، فرمایا ہے: 'فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ، وَ اِمَّا فِدَآءً'۔ یہ دوسرا حکم ہے۔ چنانچہ اسلوب پھر وہی ہو گیا ہے جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں ہے۔ اُس کے لیے شرط کا فقرہ 'فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' ہے اور اِس کے لیے 'فاذا شددتم الوثاق'، جسے اِس لیے حذف کر دیا ہے کہ 'شُدُّوا الْوَثَاقَ' کے الفاظ اُس پر دلالت کر رہے ہیں۔ پہلا حکم اُس صورت سے متعلق ہے، جب کافروں سے مڈ بھیڑ ہو اور دوسرا اُس صورت سے، جب اِس طرح کے کسی موقع پر قیدی پکڑے جائیں۔ اِس کی ضرورت اِس وجہ سے پیش آئی ہے کہ 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' میں جو ترغیب و تحریض ہے، اُس کی بنا پر لوگ قیدیوں کو قتل بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ اُس کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: فدیہ لینا ہے یا احسان کرنا ہے۔

'مَنًّا' کے لفظ سے بھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اِس جملے میں کسی زائد معنی کے لیے نہیں آیا، بلکہ محض بلا معاوضہ رہا کر دینے کے مفہوم پر دلالت کے لیے آیا ہے۔ معاوضہ لینے کا حق ہو اور نہ لیا جائے تو اِسے احسان ہی سے تعبیر کیا جائے گا۔ 'تحریر'، 'تسریح' اور 'اطلاق' کے الفاظ اِس کی جگہ نہیں آ سکتے تھے۔ یہ اگر لائے جاتے تو 'مجانا' یا 'دون عوض' یا 'من غیر شئ' یا اِسی مفہوم کے کسی لفظ کا اضافہ ضروری تھا۔ قرآن کے اداشناس جانتے ہیں کہ

یہ اُس کا اسلوب نہیں ہے۔ فدیے کے مقابل میں یہ موزوں ترین لفظ ہے جو بلا معاوضہ چھوڑ دینے کے مفہوم پر دلالت کرسکتا تھا، اِس لیے کہ بلا معاوضہ رہائی جنگی قیدیوں کا حق نہیں ہے کہ اُسے احسان سے تعبیر کیا جائے تو اُس میں کوئی زائد معنی ماننا ضروری ہو جائے۔ وہ بجاے خود احسان ہے۔

پھر یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ 'مَنًّا' اور 'فِدَآءً'، دونوں اپنے ہی فعل کے مصدر ہیں جو 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' کی طرح فعل کی جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہ 'اطلق' یا اِس کے ہم معنی کسی فعل سے حال یا مفعول لہ واقع نہیں ہوئے اور نہ جملہ 'ثم لا یکون اطلاقھم الّا' کے انداز کا ہے کہ اُس کی ترجمانی اِن الفاظ میں کی جاسکے کہ ''اُس کے بعد اگر یہ تمھارے ہاتھ سے چھوٹیں تو صرف دو ہی شکلوں سے چھوٹیں: یا تو تمھارے احسان کا قلادہ اپنی گردن میں لے کر یا فدیہ دے کر''۔ اِن کی تالیف یہ ہے: 'فاما تمنون منًا، و اما تفدون فداء'۔ اہل علم جانتے ہیں کہ اِس جملے کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ تم اُن پر احسان دھر کر اُنھیں رہا کرو گے، بلکہ یہی ہوں گے کہ اُن پر احسان کرو گے اور اُنھیں رہا کر دو گے۔ زمخشری نے اِسی مفہوم کو 'ان یمنوا علیھم فیطلقوھم' کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ ''الکشاف'' میں ہے:

و المعنی: التخییر بعد الاسر بین ان یمنوا علیھم فیطلقوھم، و بین ان یفادوھم. (۳۲۰/۴)

''آیت کے معنی یہ ہیں کہ قیدی بنا لینے کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: یا اُن پر احسان کیا جائے گا اور رہا کر دیا جائے گا یا رہائی کے عوض میں اُن سے فدیہ لیا جائے گا۔''

آیت کا یہ تجزیہ پیش نظر رہے تو ترجمہ اِس طرح ہو گا:

''پس جب اِن منکرین سے تمھاری مڈبھیڑ ہو تو گردنیں مارنی ہیں، یہاں تک کہ اِنھیں جب اچھی طرح تہ تیغ کر لو، تب قیدی بنا کر باندھو۔ پھر جب باندھ لو تو احسان کرنا ہے یا فدیہ لینا ہے۔ (تمھارا یہی معاملہ اِن کے ساتھ رہنا چاہیے) تاآنکہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے۔''

یعنی مڈبھیڑ ہو تو اصل تقاضا گردنیں مارنے کا ہے۔ تمھارا پروردگار یہی چاہتا ہے کہ مقابلے پر آئیں تو زیادہ سے زیادہ تہ تیغ کیے جائیں۔ قیدی بنانے کا اقدام اُس وقت ہونا چاہیے، جب تہ تیغ کرنے کا حق ادا ہو چکا ہو، لیکن بنا لو گے تو قتل نہیں کر سکتے۔ اُس کے بعد قانون یہ ہے کہ فدیہ لیا جائے گا یا بلا معاوضہ رہا کیا جائے گا۔ اِن کے اندر جنگ کا حوصلہ جب تک ختم نہیں ہو جاتا، تمھارے لیے یہی حکم ہے۔ چنانچہ آگے فرمایا ہے: 'ذٰلِكَ'، تمھیں یہی کرنا ہے۔

اِس روشنی میں دیکھیے تو سارا زور 'ضَرْبَ الرِّقَابِ' پر ہے۔ اِس کے علاوہ جو کچھ کہا گیا ہے، اِس کی تاکید مزید اور قیدی بنانے کے لیے لوگوں کی مبادرت کو روکنے کے لیے کہا گیا ہے۔ اوپر کی بحث سے واضح ہے کہ 'اِمَّا مَنًّا بَعْدُ، وَ اِمَّا فِدَآءً' کا حکم بھی اِسی مضمون سے متعلق ایک برسر موقع تنبیہ کے لیے آیا ہے۔ تاہم قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ کلام کے اصل رخ کو متاثر کیے بغیر اُس نے اپنا وہ قانون بھی بیان کر دیا ہے جو اسیران جنگ کے معاملے میں ملحوظ رہنا چاہیے۔ اِس کی مثالیں قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی ہیں، جہاں اِسی طریقے سے موقع پیدا ہوا ہے تو شریعت کے احکام بھی بیان ہو گئے ہیں۔

قرآن کا یہ حکم عام ہے، اِس لیے کہ قیدی بنا لینے کے بعد جب رسول کے منکرین سے احسان یا فدیے کے سوا کوئی معاملہ نہیں کیا جا سکتا تو دوسروں سے بدرجۂ اولیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اِس کے معنی کیا یہ ہیں کہ اِس حکم میں کوئی استثنا نہیں ہو سکتا؟ علم و عقل کے مسلمات جن مستثنیات کا تقاضا کرتے ہیں، وہ ہر قانون، ہر قاعدے اور ہر حکم میں اُس کی ابتدا ہی سے مضمر ہوتے ہیں۔ زبان و بیان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔ زمانۂ رسالت میں اللہ و رسول کے ایسے معاندین بھی تھے جو دشمنی میں حد سے بڑھے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ پھر جنگی قیدیوں میں سنگین جرائم کے مرتکبین بھی ہوتے تھے۔ یہ سب یقیناً مستثنیٰ ہوں گے۔ لہٰذا اِس طرح کے مجرموں کا جرم متعین ہو جائے اور اُس کی پاداش میں اُن کو قتل کیا جائے یا اُس زمانے کی روایت کے مطابق غلام بنا کر فروخت کر دیا جائے، اِس سے قیدیوں کے بارے میں اِس عام قانون پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

رہی یہ بات کہ روایات کیا کہتی ہیں، تو اُن کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے تنہا سیدہ جویریہ کا واقعہ کافی ہے۔ وہ کوئی عام خاتون نہیں ہیں۔ اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اُن کا واقعہ اِس لحاظ سے بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے کہ اُن کی رہائی کے طفیل کم و بیش سو خاندانوں کے قیدی رہا ہوئے۔ لیکن روایتوں کا حال کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے:

ایک روایت یہ بتاتی ہے کہ اُنھیں لونڈی بنا کر ثابت بن قیس کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ ثابت رضی اللہ عنہ سے اُنھوں نے درخواست کی کہ مکاتبت کر لیں۔ وہ راضی ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں کہ مکاتبت کی رقم ادا کرنے کے لیے اُن کی مدد کی جائے۔ حضور نے فرمایا: اگر اِس سے بہتر معاملہ کیا جائے تو قبول کرو گی؟ اُنھوں نے پوچھا: وہ کیا ہو سکتا ہے؟ فرمایا: میں تمھاری طرف سے مکاتبت کی رقم ادا کر کے تم سے نکاح کر

لیتا ہوں۔

دوسری یہ بتاتی ہے کہ اِس سے پہلے ہی اُن کے والد پہنچ گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی۔ میری شان اِس سے بالاتر ہے۔ آپ اُسے رہا کر دیں۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ بہتر نہیں کہ خود بیٹی سے پوچھ لیا جائے؟ والد نے پوچھا تو اُنھوں نے کہا: میں حضور کی خدمت میں رہنا پسند کروں گی۔

تیسری یہ بتاتی ہے کہ اِن میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ وہ قیدی تھیں، اُن کے والد آئے، زر فدیہ ادا کیا اور اُنھیں آزاد کرا لیا۔ اِس کے بعد اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں دے دیا۔

یہی معاملہ اُن کے ساتھ دوسرے قیدیوں کی رہائی کا ہے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتے دار ہو جانے کی وجہ سے رہا کیا اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضور ہی کے پاس تھے۔ آپ نے اُنھیں سیدہ کا مہر قرار دے کر آزاد کر دیا*۔

یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے۔ اِس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی واقعات کے سمجھنے میں اِن روایتوں پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے دقت نظر کے ساتھ اِن کا مطالعہ کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ راویوں کا فہم، اُن کا ذہنی اور سماجی پس منظر اور اُن کے دانستہ یا نادانستہ تصرفات بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ دین کے طالب علموں کے لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ روایتوں سے قرآن کو سمجھنے کے بجاے اُنھیں خود روایتوں کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

---

* الطبقات الکبریٰ، ابن سعد ۸/۱۱۶۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۹)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى يُخْرِجُ الْحَىَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ
مِنَ الْحَىِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾ فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَعَلَ الَّيْلَ

دانے اور گٹھلی کو پھاڑنے والا اللہ ہے۔[۱۳۶] وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردہ کو زندہ سے نکال لانے والا ہے۔[۱۳۷] یہ ہے اللہ تو کہاں پھرے جاتے ہو؟[۱۳۸] وہی صبح نکالنے والا ہے۔[۱۳۹] رات کو سکون کی

۱۳۶؎ یعنی ایک چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی کو دیکھو، اُسے زمین کی تہوں میں پھاڑ کر اُس سے درختوں اور پودوں کی کونپلیں کون نکالتا ہے۔ یہ خدا ہی کی قدرت ہے کہ اُس نے ایک ایک بیج اور ایک ایک گٹھلی میں یہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ پھر وہی ہے جو اپنی کائنات کی ہر چیز کو اُن کی صلاحیتیں بروے کار لانے کے لیے امر فرماتا ہے۔ اِن سب چیزوں میں کیا اُس کے سوا کسی اور کا تصرف دیکھتے ہو؟ ہرگز نہیں، تم بھی جانتے ہو کہ تنہا اللہ ہے جو دانے اور گٹھلی سے لے کر پوری کائنات پر بلا شرکت غیرے حکومت کر رہا ہے۔ اِس میں کسی دوسرے کو ادنیٰ اختیار بھی ہوتا تو اِن میں سے کوئی چیز نہ وجود پذیر ہو سکتی تھی اور نہ بروے کار آ سکتی تھی۔

۱۳۷؎ مردہ سے زندہ کو نکالنے کے لیے فعل استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مقصود تصویر حال ہے، لیکن زندہ سے مردہ کو نکالنے کے لیے فاعل کا صیغہ استعمال فرمایا ہے جس میں عزم اور فیصلے کا مفہوم بھی شامل ہو گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ کوئی

سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿۹۶﴾ وَهُوَ الَّذِىْ
جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِىْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ

چیز اُسی نے بنایا ہے[۱۴۰] اور سورج اور چاند ایک حساب سے رکھے ہیں[۱۴۱]۔ یہ اُسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھیرائے ہوئے اندازے ہیں[۱۴۲]۔ وہی ہے جس نے تمھارے لیے تارے بنائے تاکہ صحرا

چاہے یا نہ چاہے، خدا زندگی کو موت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اُس کا یہ قانون ایسا اٹل ہے کہ زندگی حاصل ہو جانے کے بعد کسی جان دار کو زندگی سے بڑھ کر کوئی چیز محبوب نہیں ہوتی، مگر خدا کا فیصلہ نافذ ہو کے رہتا ہے اور وہ اپنی یہ محبوب ترین چیز بھی اُس کے حوالے کر دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ موت اور زندگی کا یہ قانون جس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے، استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اُس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کے بے جان دانے سے ہرا بھرا درخت اور لہلہاتا ہوا پودا پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اسی سبز و شاداب درخت اور لہلہاتے ہوئے پودے پر زردی، خشکی اور مردنی طاری ہونی شروع ہوتی ہے، یہاں تک کہ ایک دن وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہی مشاہدہ ہم انسانوں اور حیوانوں میں کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ قوموں اور ملتوں کے اندر بھی موت اور زندگی، عروج اور زوال کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ ایک قوم پردۂ عدم سے نکلتی ہے، ساری دنیا پر چھا جاتی ہے اور پھر وہی قوم، ایک دن آتا ہے کہ پردۂ عدم میں جا چھپتی ہے۔ موت اور زندگی کے اِس قانون سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی اور کا بھی اِس کائنات میں مالکانہ و خود مختارانہ تصرف ہے تو کسی ایک گوشے ہی میں وہ اِس قانون کو باطل کیوں نہیں کر دیتا اور اگر خدا سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ یہ سب کچھ مجرد مادے یا کسی اندھی بہری طاقت کا بروز ہے تو اِس کا تقاضا تو یہ تھا کہ یہ بروز قائم و دائم رہے، نہ اِس میں کبھی انقطاع ہو، نہ اِس کے رخ میں کوئی تبدیلی واقع ہو، نہ اِس پر کوئی تغیر طاری ہو۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۱۱۷)

۱۳۸؎ یعنی خدا کی یہ شانیں دیکھتے ہو اور اِس کے باوجود اُس کے شرکا بنانے کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہو؟

۱۳۹؎ یعنی جو زمین کے اندر دفن ہونے والے دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر درخت اور سبزہ پیدا کرتا ہے، اُس کی شانیں آسمان میں بھی دیکھو، وہی پردۂ شب کو چاک کر کے اُس کے اندر سے صبح کو نمودار کرنے والا بھی ہے۔

۱۴۰؎ اِس سے یہ اشارہ خود بخود نکلا کہ رات انسان کے لیے راحت و سکون کا بستر اِسی لیے بچھاتی ہے کہ اُس کے بعد صبح ہونی ہے جس میں اُسے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں میں مصروف ہو جانا ہے۔

۱۴۱؎ یعنی اُن کے لیے ایک ضابطہ اور نظام الاوقات مقرر کیا ہے جس سے وہ آسمان میں ہوتے ہوئے زمین

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۹۷﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ
وَّمُسْتَوْدَعٌ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿۹۸﴾ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ

اور سمندر کی تاریکیوں میں اُن سے رہنمائی حاصل کرو۔ ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو جاننا چاہیں۔[143] وہی ہے جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا ہے،[144] پھر ہر ایک کے لیے ایک جاے قرار ہے[145] اور اُس کے سپرد خاک کیے جانے کی جگہ بھی۔[146] ہم نے اپنی نشانیاں اُن لوگوں کے

والوں کے لیے موسم پیدا کرتے اور دن، مہینے اور سال معین کرتے ہیں۔

۱۴۲؎ یہ جملہ اِس طریقے سے آیا ہے گویا عقل سلیم کے ساتھ اِس کائنات پر غور کرنے والے ہر دل کی صدا ہے جو بے اختیار زبان پر آ گئی ہے۔

۱۴۳؎ اصل الفاظ ہیں: 'لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ'۔ اِن میں فعل ارادۂ فعل کے لیے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ نشانیاں مانگتے ہو تو دیکھ لو، علم کے سچے طالبوں کے لیے یہ نشانیاں کیا کم ہیں جو ہم نے کھول کر بیان کر دی ہیں۔

۱۴۴؎ یعنی آدم سے پیدا کیا ہے۔ یہ اب خارجی عالم کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد انسان کو خود اُس کی خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ صورت، شکل، زبان اور لہجے کے اختلافات کے باوجود تمھارا وجود اپنے جبلی تقاضوں اور فطری داعیات سے شہادت دیتا ہے کہ تم سب ایک ہی آدم کی اولاد ہو اور تمھارا خالق بھی ایک ہی ہے جس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ آیت میں اِس کے لیے لفظ 'اَنْشَاَ' استعمال ہوا ہے جس کے معنی صرف پیدا کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ یہ بھی ہیں کہ تمھیں نشوونما بخشی، پروان چڑھایا اور اِس طرح فروغ دیا ہے کہ اُس کی قدرت و حکمت کا ایک معجزہ بن گئے ہو۔

۱۴۵؎ یعنی رہنے بسنے کی جگہ ہے جس میں وہ اتنے دن لازماً گزارتا ہے جو اُس کے لیے مقدر ہوتے ہیں اور جو رزق لکھا ہوتا ہے، اُس سے متمتع ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ چیز خود بتاتی ہے کہ جس نے پیدا کیا ہے، یہ مستقر بھی اُسی کا دیا ہوا ہے، اِس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۱۴۶؎ اصل میں لفظ 'مُسْتَوْدَعٌ' آیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں: وہ جگہ جہاں کوئی چیز امانت و ودیعت کے طور پر حفاظت سے رکھی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد کہاں رکھے جاؤ گے، اِس کی جگہ بھی اُسی پروردگار نے متعین کر رکھی ہے تاکہ جب چاہے اپنی یہ امانت زمین کی تحویل سے واپس مانگ لے۔

السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا
مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِیَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّیْتُوْنَ
وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِهٍ اُنْظُرُوْٓا اِلٰی ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَیَنْعِهٖ اِنَّ فِیْ

لیے کھول کر بیان کر دی ہیں جو سمجھنا چاہیں[147]۔ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر اُس سے ہر چیز کے انکھوے ہم نے نکالے[148]، پھر اُس سے سرسبز شاخیں اٹھائیں جن سے ہم تہ بر تہ چڑھے ہوئے دانے پیدا کر دیتے ہیں[149]۔ اور کھجور کے شگوفوں سے لٹکتے ہوئے گچھے (بھی اِسی سے پیدا ہوتے ہیں[150]) اور انگوروں کے باغ اور زیتون اور انار بھی (ہم نے اِسی سے پیدا کیے ہیں)، جن کے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور الگ الگ بھی[151]۔ (اِن میں سے) ہر ایک کے پھل کو دیکھو، جب وہ پھلتا ہے

۱۴۷؎ پہلے فرمایا تھا: جو جاننا چاہیں۔ جاننے کی خواہش انسان کو حقائق کی طرف متوجہ کرتی ہے اور سمجھنے کی خواہش اُس کے اندر محسوسات سے آگے بڑھ کر دیکھنے کا حوصلہ پیدا کر دیتی ہے۔

۱۴۸؎ غائب سے متکلم کی طرف یہ التفات نہایت دل نواز ہے۔ گویا کمال رافت و رحمت سے انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے کہ ادھر دیکھو، یہ ہمیں ہیں کہ آسمان کے پانی سے تمھارے لیے کیا کچھ پیدا کر دیتے ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...اِس میں رافت، عنایت اور ربوبیت کا اظہار بھی ہے اور اِس حقیقت کی طرف اشارہ بھی کہ آسمان و زمین اور ابر و ہوا، سب پر ہماری ہی حکومت ہے۔ اگر آسمان پر کسی اور کی حکومت ہوتی، زمین پر کسی اور کی تو یہ توافق کہاں سے ظہور میں آتا کہ آسمان سے پانی برستا اور زمین اپنے خزانے اگل دیتی۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۱۲۴)

۱۴۹؎ یعنی پہلے سرسبز خوشے اور بالیاں نکالتے ہیں، پھر اپنی قدرت و حکمت سے اُن پر تہ بر تہ دانے جما دیتے ہیں۔

۱۵۰؎ غلے کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا ہے اور اُن میں سب سے پہلے کھجور کو لیا ہے جو اہل عرب کا عام پھل تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”...کھجور کا ذکر اِس طرح فرمایا ہے کہ اُس کے درخت، اُس درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اُس سے لٹکتے ہوئے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا، ہر چیز کی طرف توجہ دلا دی ہے تا کہ اُس کاری گری پر انسان کی نظر پڑے جو اُس

ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾

اور اُس کے پکنے کو دیکھو، (جب وہ پکتا ہے[۱۵۲])۔ اِن کے اندر اُن لوگوں کے لیے بڑی غیر معمولی نشانیاں ہیں جو ماننا چاہتے ہیں[۱۵۳]۔ ۹۵-۹۹

کے ابتداے ظہور سے لے کر اُس کی تکمیل اور پختگی تک قدرت اُس پر صرف کرتی ہے۔ اِسی کاری گری اور صنعت پر غور کرنے سے انسان کو صانع کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کی قدرت وحکمت اور اُس کی رحمت وربوبیت کا کچھ اندازہ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قدرت کا منشا اِن قدرتوں اور حکمتوں کے اظہار سے یہی ہے کہ انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو، ورنہ جہاں تک کھجور کی ضرورت مجرد غذا کے لیے ہے، اُس کی فراہمی کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی گٹھلی سے درجہ بدرجہ ایک تناور درخت بنے، پھر ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر اُس کے اندر گابھے اور خوشے پیدا ہوں، پھر اُن کے اندر ننھی ننھی کیریاں بیٹھیں، پھر وہ درجہ بدرجہ پھل بنیں، پھر پک کر اور بوجھل ہو کر اُن کے خوشے زمین کی طرف لٹک آئیں اور انسان کو زبان حال سے دعوت شوق دیں۔ یہ سارا اہتمام، دل گواہی دیتا ہے کہ اسی لیے ہے کہ انسان پر خدا کی قدرت، اُس کی ربوبیت اور اُس کی حکمت کے اسرار ظاہر ہوں۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۲۵)

۱۵۱؎ یہ اہل عرب کے معروف پھل تھے، اِس لیے صرف اِنھی کا ذکر کیا ہے اور اِن میں بھی خاص طور پر اُس گونا گونی اور بوقلمونی کی طرف توجہ دلائی ہے جس سے خدا کی ربوبیت، رحمت، فیاضی اور قدرت وحکمت کی شان نمایاں ہوتی ہے۔

۱۵۲؎ اصل الفاظ ہیں: 'اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ'۔ 'يَنْعِهٖ' کے بعد 'اذا اینع' کے الفاظ عربیت کے اسلوب پر حذف ہو گئے ہیں۔ 'اِلٰى ثَمَرِهٖٓ' میں ضمیر کا مرجع اوپر کی سب چیزیں ہیں، لیکن یہ واحد اِس لیے لائی گئی ہے کہ ہر چیز کو الگ الگ لے کر اُس پر غور کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''فرمایا کہ اِن میں سے ایک ایک چیز کو لے کر اُس کے پھلنے سے لے کر اُس کے پکنے کے مراحل تک ہر مرحلے کو دیکھو اور اُس پر غور کرو تو خالق کی قدرت، حکمت، ربوبیت، صناعی، کاری گری، باریک بینی، فیض بخشی اور اُس کے حسن وجمال کی اتنی نشانیاں اور اتنی شہادتیں تمھارے سامنے آئیں گی کہ تم اُن کو شمار نہیں کر سکو گے۔ تم ایک نشانی اور ایک معجزہ مانگتے ہو، آنکھیں ہوں تو ہر شاخ معجزہ، ہر پھول معجزہ، ہر پھل معجزہ۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر قدرت کے اعجاز کے ہزاروں شاہ کار جلوہ نما نہ ہوں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ دنیا اپنے بقا کے لیے اِن تمام عجائب کی نمایش کی محتاج نہ تھی۔ یہ بالکل سادہ اور بے رنگ حالت میں بھی وجود میں آ سکتی

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ

لیکن (اِن کی سفاہت کا یہ عالم ہے کہ) اِنھوں نے جنوں میں سے خدا کے شریک ٹھیرا دیے ہیں[۱۵۴]،

اور باقی رہ سکتی تھی، لیکن خالق کائنات نے یہ پسند فرمایا کہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتی سے اُس کی عظیم قدرت و حکمت اور اُس کی بے نہایت رحمت و ربوبیت ظاہر ہو تاکہ انسان اُس کی معرفت حاصل کرے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب بدقسمتی ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنی ذہانت کے مظاہرے کا اتنا شوقین ہے کہ اگر ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے مدفون کھنڈروں سے کوئی ٹوٹا ہوا مٹی کا مرتبان بھی اُس کو ہاتھ آ جائے تو اُس پر کھنچی ہوئی آڑی ترچھی لکیروں سے وہ اُس عہد کے آرٹ، اُس عہد کے کلچر، اُس عہد کی تہذیب، اُس دور کے مذہب، اُس دور کی سیاست، غرض ہر چیز پر ایک مزعومہ فلسفہ اور ایک فرضی تاریخ تیار کر دے گا، دوسری طرف اُس کی بلادت اور بدذوقی کا یہ عالم ہے کہ خالق کائنات نے ایک ایک پتی پر اپنی حکمت کے جو دفاتر رقم فرمائے ہیں، نہ اُن کا کوئی حرف اُس کی سمجھ میں آتا ہے نہ اُن سے اُسے کوئی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۱۲۷)

۱۵۳؂ یعنی ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہیں۔ بات سمجھ میں آ جائے تو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ علم اور تفقہ کے ساتھ یہ تیسری چیز بھی ضروری ہے۔ یہ نہ ہو تو آدمی سامنے پڑی ہوئی چیزوں کو بھی دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ اِس طرح کے لوگوں کے لیے اِس بات کی غیرمعمولی نشانیاں ہیں کہ اِس کائنات کی خدائی اگر مختلف دیوتاؤں اور خداؤں میں بٹی ہوئی ہوتی تو رائی کا ایک دانہ بھی اپنی صلاحیتیں اجاگر نہیں کر سکتا تھا؛ موت و حیات کا کارخانہ جس تواتر کے ساتھ اور ایک قانون اور قاعدے کے مطابق چل رہا ہے، ایک دن کے لیے بھی نہیں چل سکتا تھا؛ رات اور دن میں یہ توافق اور سازگاری ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک انسان کے لیے راحت کا بستر بچھائے اور ایک اُس کے لیے معاش اور معیشت کی سرگرمیوں کا میدان گرم کر دے؛ آسمان کے تارے زمین والوں کے لیے شمع برداری کی خدمت انجام نہیں دے سکتے تھے؛ انسان اُن تنوعات کے ساتھ جو ہر قوم اور قبیلے سے نمایاں ہیں، ایک ہی سمت میں تہذیب کا سفر جاری نہیں رکھ سکتے تھے؛ زندگی، رزق اور اسباب و وسائل میں ایک دوسرے کے لیے ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی تھی؛ کائنات کے اجزاے مختلفہ اِس قدر تدبیر و حکمت کے ساتھ انسان کی زندگی کے بقا کا ذریعہ نہیں بن سکتے تھے۔ یہ حقائق گواہی دیتے ہیں کہ سورج، چاند، ابر و ہوا، نور و ظلمت، سردی گرمی، بہار و خزاں، زمین و آسمان، غرض یہ کہ کائنات کی ہر چیز پر ایک ہی قادر و قیوم کی حکمرانی ہے۔ اِس کائنات کو بنانے اور اِس کو چلانے میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں

سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَصِفُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾ بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَنّٰی یَکُوۡنُ لَهٗ

دراں حالیکہ اُسی نے اُنھیں پیدا کیا ہے[155] اور بغیر کسی علم کے اُس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں تصنیف کر لی ہیں[156]۔ وہ پاک اور بالاتر ہے اُن سب چیزوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں[157]۔ وہ تو زمین و آسمان کو عدم

ہے۔ الا له الخلق و الامر، تبارك الله رب العلمين۔

۱۵۴؎ یعنی اِس کے باوجود کہ خدا کی یہ شانیں شب و روز دیکھتے ہیں، لیکن اِن احمقوں کی خرد باختگی، سفاہت اور بوالفضولی دیکھو کہ جنوں اور بھوتوں کو اُس کا شریک ٹھیراتے ہیں اور اِس طرح گویا اپنے توہمات کو خدا بنا کر اُن کی پرستش کر رہے ہیں۔

۱۵۵؎ یہ کلام کے بیچ میں ایک جملۂ معترضہ ہے جس سے بلا تاخیر اِس لغویت کی تردید فرما دی ہے کہ خدا کی ایک مخلوق اُس کی شریک بھی ہو سکتی ہے۔

۱۵۶؎ اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کا درجہ دیتے اور اُن کی مورتیں بنا کر دیویوں کی حیثیت سے اُن کی پوجا کرتے تھے۔ یہی معاملہ مسیحیوں نے سیدنا مسیح کے ساتھ کیا اور اُنھیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ یہ سب بغیر کسی عقلی یا نقلی دلیل کے کیا گیا۔ نہ خدا نے کبھی اِس کی شہادت دی اور نہ عقل و فطرت کے اندر کوئی چیز کبھی اِس کے حق میں پیش کی جا سکی۔

۱۵۷؎ اصل میں لفظ 'سُبۡحٰنَهٗ' آیا ہے۔ یہ تنزیہہ کا کلمہ ہے، لیکن اِس کے اندر توحید کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”...عقل و فطرت کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ کسی چیز کی طرف کوئی ایسی صفت منسوب نہ کی جائے جو اُس کی ثابت، مسلم اور بدیہی صفات کے ضد یا منافی ہو۔ اگر ایسا کیا جائے تو اِس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی مانی ہوئی ایک حقیقت اپنے ہی دوسرے مفروضے سے باطل ہو جاتی ہے۔ اگر ایک شخص بادشاہ ہے تو اُس کی طرف غلامی کی صفات منسوب نہیں ہو سکتیں۔ فرشتہ ہے تو اُس کو شیطان کی صفات سے ملوث نہیں کیا جا سکتا۔ اِسی طرح جو ذات خالق، مالک، قدیر، علیم اور کریم و رحیم ہے، اُس کو اُن صفات سے متصف کرنا جو مخلوق کی صفات ہیں، اُس کی اُن تمام صفات کی نفی کے ہم معنی ہے جن کا ماننا ازروے عقل و فطرت واجب ہے اور جن کی نفی سے انسان اُن تمام تاریکیوں میں پھر گھر جاتا ہے جن سے اِن صفات کے علم کی روشنی ہی نے اُس کو نکالا تھا۔ اگر خدا کو خدا ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اُس کا شریک قرار دے دیا گیا اور اُس کو بیٹوں اور بیٹیوں کا باپ بنا دیا گیا تو پھر وہ خدا کہاں رہا؟ پھر تو اُس کے کفو و ہم سر بھی پیدا ہو گئے، اُس کی ذات برادری کے شریک بھی نکل آئے اور اُس کے مدمقابل

وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَیۡءٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۰۱﴾ ذٰلِكُمُ
اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَیۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیۡءٍ وَّكِیۡلٌ ﴿۱۰۲﴾
لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَهُوَ یُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ ﴿۱۰۳﴾
قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ عَمِیَ فَعَلَیۡهَا ؕ وَمَاۤ

سے وجود میں لانے والا ہے۔ اُس کے اولاد کہاں سے آئی، جبکہ اُس کی کوئی بیوی ہی نہیں ہے[۱۵۸]۔ اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے[۱۵۹]۔ وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا اُسی کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز پر نگران ہے۔ اُس کو نگاہیں نہیں پا سکتیں، لیکن وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے[۱۶۰]۔ وہ نہایت باریک بین اور بڑا باخبر ہے[۱۶۱]۔ ۱۰۰-۱۰۳

تمھارے پروردگار کی طرف سے بصیرت کی آیتیں تمھارے پاس آ چکی ہیں۔ چنانچہ اب جو بصیرت

اور حریف بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔'' (تدبر قرآن ۳/۱۳۰)

۱۵۸؎ یعنی جب اُس کی بیوی نہیں مانتے تو اولاد کہاں سے پیدا کر لیتے ہو؟ تمھیں بھی تسلیم ہے کہ وہی سب کا خالق ہے، پھر تعجب ہے کہ اُس کے پیدا کیے ہوئے فرشتوں، جنات اور انسانوں کو اُس کی ذات اور اُس کی خدائی میں شریک ٹھیراتے ہو۔

۱۵۹؎ یعنی جب اُس نے پیدا کیا ہے اور وہ اپنی مخلوقات کی ایک ایک چیز سے واقف بھی ہے تو اُس کو چھوڑ کر کسی اور کے آستانے پر جانے اور سر جھکانے کی کیا ضرورت ہے؟

۱۶۰؎ مطلب یہ ہے کہ تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تو کیا ہوا۔ اِس کا نتیجہ کیا یہی ہونا چاہیے کہ اُس کی ذات کے مظاہر اور اوتار بنا کر اُنھیں پوجنا شروع کر دو اور اِس حماقت کی توجیہ یہ پیش کرو کہ خوگر پیکر محسوس ہے انسان کی نظر؟ ہرگز نہیں، اُس کی نگاہیں تو ہر جگہ اور ہر وقت دیکھتی ہیں، لہٰذا تمھارے ایمان، اعتماد اور بندگی و اطاعت کے لیے یہی کافی ہے اور یہی کافی ہونا چاہیے۔

۱۶۱؎ لہٰذا تم سے باخبر رہنے کے لیے اُسے اُن مزعومہ وسائل و وسائط کی کوئی ضرورت نہیں ہے جن پر تم بھروسا کیے بیٹھے ہو۔

اَنَا عَلَیۡکُمۡ بِحَفِیۡظٍ ﴿۱۰۴﴾ وَ کَذٰلِکَ نُصَرِّفُ الۡاٰیٰتِ وَ لِیَقُوۡلُوۡا دَرَسۡتَ وَ لِنُبَیِّنَهٗ لِقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۰۵﴾

اِتَّبِعۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنۡ رَّبِّکَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ اَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشۡرَکُوۡا وَ مَا جَعَلۡنٰکَ عَلَیۡهِمۡ حَفِیۡظًا وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡهِمۡ بِوَکِیۡلٍ ﴿۱۰۷﴾

حاصل کرے گا، اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنا رہے گا، اُس کا وبال بھی وہی اٹھائے گا اور (جہاں تک میرا تعلق ہے تو) میں تم پر کوئی نگران نہیں ہوں[162]۔ ہم اپنی آیتیں اِسی طرح مختلف اسلوبوں سے پیش کرتے ہیں، (اِس لیے کہ اُن پر حجت قائم ہو[163]) اور اِس لیے کہ وہ بول اٹھیں[164] کہ تم نے اچھی طرح پڑھ کر سنا دیا اور اِس لیے کہ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں، اِسے ہر لحاظ سے واضح کر دیں۔ ۱۰۴-۱۰۵

تم اُس چیز کی پیروی کرتے رہو، (اے پیغمبر)، جو تمھارے پروردگار کی طرف سے تم پر وحی کی جا رہی ہے۔ (حقیقت یہی ہے کہ) اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور (یہ نہیں مانتے تو) اِن مشرکوں کو جانے دو۔ اگر اللہ چاہتا تو یہ کبھی شرک نہ کر پاتے۔ ہم نے اِن پر تمھیں نگران مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم اِن کے ضامن ہو[165]۔ ۱۰۶-۱۰۷

۱۶۲؎ یہ الفاظ براہ راست لسان نبوت پر ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”... یوں ارشاد نہیں ہوا کہ اِن لوگوں سے کہہ دو، بلکہ کہنے کی بات پیغمبر نے خود براہ راست فرما دی۔ وحی کی یہ قسم روح نبوت کے غایت قرب و اتصال کی دلیل ہوتی ہے۔ گویا منبع فیض کا فیضان خود زبان رسالت سے چھلک پڑتا ہے۔ ’گفتۂ او گفتۂ اللہ بود‘ شاید اسی حقیقت کی تعبیر ہے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۱۳۳)

۱۶۳؎ یہ ’وَلِیَقُوۡلُوۡا‘ کا معطوف علیہ ہے جو عربیت کے اسلوب پر اصل میں محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۱۶۴؎ یعنی زبان سے بے شک اقرار نہ کریں، مگر اپنے دل میں پکار اُٹھیں کہ تو نے اِس طرح پڑھ کر سنایا ہے کہ گویا کتاب کو گھس ڈالا ہے اور اِس طرح احقاق حق کا حق ادا کر دیا ہے۔

۱۶۵؎ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ اِنھیں جبراً شرک سے روک دے تو یہ کبھی شرک نہ کر پاتے، لیکن اُس کی

وَ لَا تَسُبُّوا الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدۡوًاۢ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ ؕ كَذٰلِكَ
زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمۡ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمۡ مَّرۡجِعُهُمۡ فَيُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾

(یہ جس سفاہت میں مبتلا ہیں، اُس کے باوجود) تم لوگ اُنھیں گالی نہ دو جنھیں اللہ کے سوا یہ پکارتے ہیں، مبادا تجاوز کر کے یہ بن سمجھے اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔[۱۶۶] (اِس لیے کہ) ہر گروہ کے عمل کو ہم نے اِسی طرح اُس کے لیے خوش نما بنا رکھا ہے۔[۱۶۷] پھر (ایک دن) اُنھیں اپنے پروردگار کی طرف پلٹنا ہے۔ اُس وقت وہ اُنھیں بتا دے گا جو وہ کرتے رہے ہیں۔[۱۶۸] ۱۰۸

مشیت یہی ہے کہ لوگوں کو اختیار دے کر اُن کا امتحان کرے کہ کون توحید کی صراط مستقیم پر چلتا ہے اور کون شرک کی راہ اختیار کرتا ہے۔ تم نہ اِن پر داروغہ مقرر کیے گئے ہو اور نہ اِن کے ضامن ہو کہ نہیں مانیں گے تو جواب دہ ٹھیرائے جاؤ گے، اِس لیے اپنی ذمہ داری ادا کرو اور اِنھیں اِن کے حال پر چھوڑ دو، یہ اپنے کرتوتوں کا خمیازہ خود بھگت لیں گے۔

۱۶۶؎ یہ ایک برمحل ہدایت ہے اور اِس لیے کی گئی ہے کہ شرک پر جو تنقید اوپر ہوئی ہے، اُس کے زیر اثر مسلمان کہیں حدود سے تجاوز نہ کر بیٹھیں۔ عقل و انصاف یہی چاہتے ہیں کہ بات ہمیشہ اصول و عقائد اور افکار و نظریات کی تنقید و توضیح تک محدود رہے۔ پھر دعوت کے نقطۂ نظر سے بھی صحیح طریقہ یہی ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ مخاطبین چونکہ خدا کی صفات اور اُس کے حقوق کا صحیح علم نہیں رکھتے، اِس لیے وہ بھی حدود سے تجاوز کریں اور جھوٹے خداؤں کی حمیت میں سچے خدا کو گالیاں دینے لگیں۔

۱۶۷؎ یہ مزید تنبیہ ہے۔ مدعا یہ ہے کہ رسوم، روایات اور معتقدات کی محبت خود اللہ تعالیٰ نے ہر قوم کی فطرت میں ودیعت فرمائی ہے۔ چنانچہ عقائد و اعمال کی تطہیر ضرور کی جائے، مگر اِس کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جو اِن چیزوں کے لیے لوگوں کے جذبۂ حمیت کو بھڑکانے کا باعث بن جائے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''یہاں 'تزئین' کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف جو منسوب فرمایا ہے، یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر قوم کے اندر اپنی مالوفات سے دل بستگی اور اپنی روایات ملی و اجتماعی کے لیے یہ عصبیت ایک حد تک فطری چیز ہے۔ یہ نہ ہو تو قومی و ملی وحدت وجود ہی میں نہیں آ سکتی۔ خاندانوں، قوموں، وطنوں کی شیرازہ بندی اِسی چیز سے ہوئی ہے۔ یہ معدوم ہو جائیں تو افراد ہوا میں اڑتے ہوئے پتوں کے مانند ہو جائیں۔ اِس وجہ سے اِس چیز کا ایک مقام ہے جو تقاضائے فطرت ہے اور اِس کی رعایت ملحوظ ہونی چاہیے۔ اِس سے تعرض اُسی حد تک ہونا چاہیے جس حد تک یہ حق

کے خلاف ہے اور اُس انداز میں ہونا چاہیے جس سے خود اِس کا واجبی حق مجروح نہ ہو۔'' (تدبرقرآن ۳/ ۱۳۶)

۱۶۸؎ یعنی مطمئن رہو، تمھارا کام اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ حق واضح کر دیا جائے۔ یہ اپنی حماقتوں پر اصرار کریں گے تو خود مجرم ٹھیریں گے اور جواب دہی کے لیے ایک دن خدا کے حضور میں پیش ہو جائیں گے۔ وہاں جو کچھ بھگتنا ہے، اِنھیں بھگتنا ہے۔ اُس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہ ہوگی۔

[باقی]

طالب محسن

گناہ کے باوجود ایمان ذریعۂ نجات

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ یُحَدِّثُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ أَنَّہُ قَالَ: أَتَانِیْ جِبْرِیْلُ عَلَیْہِ السَّلَامُ فَبَشَّرَنِیْ أَنَّہُ مَنْ مَّاتَ مِنْ أُمَّتِکَ لَا یُشْرِکُ بِاللّٰہِ شَیْءًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ.

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور انھوں نے مجھے بشارت دی ہے کہ آپ کی امت میں سے جس کی اس حالت میں وفات ہوئی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا تھا، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ میں نے پوچھا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔

أَنَّ أَبَا ذَرٍّ حَدَّثَہُ قَالَ: أَتَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ نَاءِمٌ عَلَیْہِ ثَوْبٌ أَبْیَضُ ثُمَّ أَتَیْتُہُ فَإِذَا ھُوَ نَاءِمٌ ثُمَّ أَتَیْتُہُ وَقَدِ اسْتَیْقَظَ فَجَلَسْتُ إِلَیْہِ فَقَالَ: مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ قَالَ: وَإِنْ زَنٰی وَإِنْ سَرَقَ ثَلَاثًا ثُمَّ قَالَ فِی الرَّابِعَۃِ: عَلٰی رَغْمِ أَنْفِ أَبِیْ ذَرٍّ قَالَ:

فَخَرَجَ أَبُوْ ذَرٍّ وَهُوَ يَقُوْلُ: وَإِنْ رَغِمَ أَنْفُ أَبِيْ ذَرٍّ.

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا تو آپ سفید چادر لے کر سوئے ہوئے تھے۔ میں دوبارہ حاضر ہوا آپ تب بھی سوئے ہوئے تھے۔ میں پھر (تیسری مرتبہ) آیا تو آپ جاگ گئے۔ چنانچہ میں آپ کے پاس بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا پھر اسی پر اس کی وفات ہوئی مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ میں نے پوچھا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ نے فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ میں نے پھر پوچھا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟ آپ نے پھر فرمایا: اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔ تین مرتبہ اس طرح بات ہوئی اور چوتھی مرتبہ آپ نے یہ بھی کہا: ابوذر کی ناک آلودہ ہونے کے باوجود۔ ابوذر نکلے تو وہ یہ کہہ رہے تھے: اگرچہ ابوذر کی ناک آلودہ ہو۔

لغوی مباحث

'وَ إِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ': یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جملے کی حیثیت سے بھی نقل ہوا ہے اور حضرت ابوذر کے جملے کے طور پر بھی۔ مراد یہ ہے کہ یہ سوال کے محل پر بھی آیا ہے اور جواب کے محل پر بھی۔ سوال کی صورت میں اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ یہ اظہار تعجب کے معنی میں ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ سادہ طریقے پر سوال ہی ہو۔ معنی کچھ بھی ہوں، اس محل میں حرف استفہام کو مقدر ماناجائے گا۔ جواب کی صورت میں یہ جملہ شرط کے معنی میں ہے اور اس کا جواب حذف ہے، یعنی اگر اس نے یہ گناہ کیے ہوں تب بھی۔

بعض شارحین نے یہ نکتہ بھی پیدا کیا ہے کہ یہاں نمائندہ گناہوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مال کے حوالے سے ایک گناہ، آبرو کے حوالے سے ایک گناہ۔ میرا خیال ہے کہ متکلم کے پیش نظر محض کچھ گناہوں کا ذکر کرنا ہے۔ چنانچہ اس کی زبان پر وہ گناہ بطور مثال آئے ہیں جن کا ارتکاب معاشرے میں بالعموم کیا جاتا ہے اور جن کی قباحت وشناعت مسلمہ ہے۔

'عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِيْ ذَرٍّ': یہ جملہ ایک بددعا کی طرح کے جملے سے لیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے: 'أرغم الله أنفه' (اللہ اس کی ناک خاک آلود کرے)۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لاڈ کے محل میں استعمال کیا ہے۔

بول چال کی زبان میں اس طرح کے اسالیب کا استعمال خاص التفات کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

معنی

ایمان اور توحید سے نجات کا مضمون تفصیل سے پچھلی روایت کے تحت بیان ہو چکا ہے۔ اس روایت میں گناہوں کے ارتکاب کے باوجود نجات کی نوید سنائی گئی ہے۔ عذاب و سزا کے حوالے سے قرآن مجید نے مغفرت کے امکان کو کئی پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ جہاں قرآن مجید میں یہ آیت موجود ہے کہ 'مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ'، ''جو کوئی برائی کرے گا، اسے اس کی جزا ملے گی۔'' (النساء۴: ۱۲۳)، وہاں یہ آیت بھی موجود ہے کہ 'مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا'، ''جس نے کوئی برائی کی یا اپنی جان پر ظلم ڈھایا، پھر اس نے اللہ سے معافی مانگی، وہ اللہ کو بخشنے والا اور شفقت کرنے والا پائے گا۔'' (النساء۴: ۱۱۰)۔ اسی طرح سورۂ نساء ہی میں یہ نوید بھی موجود ہے کہ 'اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ'، ''اللہ اس کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، لیکن وہ اس کے علاوہ گناہ معاف کر دے گا جس کے لیے چاہے گا۔'' (۴: ۴۸)۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت بھی اسی رعایت کو بیان کرتی ہے جو قرآن مجید کی ان اور اسی مضمون کی حامل دوسری آیات سے سامنے آتی ہے۔ مزید یہ کہ اس روایت میں قول ایمان پر نوید نہیں، بلکہ حقیقی ایمان پر نوید ہے۔ حقیقی ایمان کا لازمی اظہار اعمال صالحہ ہیں۔ حقیقی ایمان کا لازمی اظہار توبہ و انابت ہے۔ جس شخص میں یہ دونوں چیزیں موجود ہوں، وہ مغفرت کا مستحق ہے اور اس روایت میں اسی مغفرت کی خبر دی گئی ہے۔

کچھ شارحین نے اس روایت کو اہل ایمان کے لیے ابدی جہنم کی سزا کی نفی کے معنی میں لیا ہے۔ یہ خدا کی مغفرت حاصل ہونے کی ایک صورت ہے۔ اسی طرح کچھ شارحین نے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے حاصل ہونے والی معافی کے حوالے سے دیکھا ہے۔ یہ مغفرت حاصل ہونے کا ایک اور مظہر ہے۔ اس روایت کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ یہ رعایت حاصل ہونے کی صورتیں ہیں۔ یہ صورتیں اور بھی ہو سکتی ہیں۔

متون

اس مضمون پر مبنی ایک روایت حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ لیکن امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت کو لیا ہے۔ حضرت ابوذر سے اس مضمون کی دو روایتیں منقول ہیں۔

دونوں میں اس مکالمے کا موقع ومحل اور درو بست مختلف بیان ہوا ہے۔ ایک میں بتایا گیا ہے کہ یہ گفتگو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے گھر میں ہوئی۔ حضرت ابوذر آئے تو آپ سفید چادر لے کر سوئے ہوئے تھے۔ جب یہ تیسری بار آئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم جاگ رہے تھے، تب یہ گفتگو ہوئی۔ دوسری میں بتایا گیا ہے کہ یہ گفتگو آبادی سے باہر احد کی طرف کی ایک کھلی جگہ پر ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی سبب سے حضرت ابوذر سے الگ ہوئے اور آپ کی ملاقات جبریل علیہ السلام سے ہوئی اور انھوں نے آپ کو یہ نوید سنائی۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس مکالمے کا احوال حضرت ابوذر کو سنایا۔ ان روایات میں کچھ اور گفتگو بھی نقل کی گئی ہے۔ ایک متن کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ ہونے سے پہلے یہ فرمایا تھا کہ میں اس بات کو پسند نہیں کروں گا کہ احد میرے لیے سونا بن جائے اور اگلی صبح تک میرے پاس ایک دینار بچا ہوا ہو۔ پھر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ زیادہ والے ہی قلت والے ہیں، اگر وہ خیرات نہ کریں۔ اس روایت کے متن میں نمایاں فرق یہی ہیں، باقی فرق محض لفظی ہیں۔

کتابیات

مسلم، رقم ۹۴؛ بخاری، رقم ۱۱۸۰، ۳۰۵۰، ۵۴۸۹، ۵۹۱۳، ۶۰۷۸، ۷۰۴۹؛ احمد، رقم ۱۸۳۱۰، ۲۱۵۰۴؛ مسند البزار، رقم ۳۹۲۰؛ ترمذی، رقم ۲۶۴۴؛ الآحاد والمثانی، رقم ۱۳۰۸؛ نسائی، رقم ۱۰۹۵۵-۱۰۹۶۶، ۱۱۵۶۰۔ ابن حبان، رقم ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۹۵، ۲۱۳، ۳۳۲۶؛ بیہقی، رقم ۲۰۵۵۷، ۲۰۵۶۰؛ موارد الظمآن، رقم ۹؛ تہذیب الآثار، رقم ۹۳۰-۹۳۸، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۷-۹۵۰، ۹۶۴۔

محمد وسیم اختر مفتی

سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ

[''سیر و سوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۲)

عائشہ بنت حضرت سعد کی روایت ہے، آپؐ نے اپنا دست مبارک حضرت سعد کی پیشانی پر رکھا، ان کے چہرے، سینے اور پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی، اللہ! حضرت سعد کو شفا دے اور اس کی ہجرت کو کامل کر دے۔ اللہ! اس کے جسم اور قلب کو تن درست کر، اس کی بیماری دور کر اور اس کی دعا قبول کر لے۔ حضرت سعد کہتے ہیں، میں آپؐ کے ہاتھ کی ٹھنڈک اپنے کلیجے پر اب بھی محسوس کرتا ہوں۔ (بخاری: ۵۶۵۹، مسند احمد: ۱۴۷۴) آپؐ نے انھیں عجوہ کھجور کھلانے اور بنو ثقیف کے طبیب حارث بن کلدہ کو دکھانے کی ہدایت بھی فرمائی۔ حضرت سعد کو معلوم تھا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم پسند نہیں فرماتے کہ آدمی اس جگہ جان دے جہاں سے ہجرت کر چکا ہے (مسلم: ۴۲۲۰) اس لیے اضطراب سے کہا، یا رسول اللہ! کیا میں اپنے ساتھیوں سے پیچھے مکہ میں رہ جاؤں گا؟ آپؐ نے تسلی دی، تو پیچھے نہیں رہے گا۔ عجب نہیں، تیری عمر دراز ہو اور تجھ سے کئی لوگوں کو فائدہ ہو اور کچھ آدمیوں کو (کافروں) کو تم سے ضرر پہنچے۔ (بخاری: ۳۹۳۶، ۴۴۰۹) آپؐ نے یہ ہدایت بھی فرمائی، اگر حضرت سعد کا یہیں انتقال ہو گیا تو انھیں مدینہ کے راستے میں دفن کرنا۔

حضرت سعد کی روایت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں مدینہ کے دو سنگلاخ پہاڑوں (عیر اور احد) کے درمیان واقع سرزمین کو حرم (قابل احترام) قرار دیتا ہوں۔ اس کے جھاڑوں کو کاٹا جائے نہ یہاں کا جانور شکار کیا جائے۔'' (مسلم: ۳۲۹۶) ایک دفعہ حضرت سعد عقیق میں واقع اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ ایک غلام کو

دیکھا کہ وہ درخت کاٹ رہا ہے اور پتے جھاڑ رہا ہے۔ انھوں نے کٹا ہوا درخت اور پتے اس سے چھین لیے۔ اس کے اہل خانہ ان کے پاس آئے اور چھینے ہوئے درخت مانگے تو حضرت سعد نے انکار کر دیا اور کہا، اللہ کی پناہ! میں وہ شے لوٹا دوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ازراہ کرم مجھے عطا کر دی ہے۔ (مسلم: ۳۲۹۹)

شاہ ایران کسریٰ کی ہلاکت کی خبر سب سے پہلے حضرت سعد کو ہوئی۔ وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بتانے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا، حضرت سعد کے چہرے پر کوئی خبر لکھی ہے۔ (بیہقی: دلائل النبوۃ)

خلفائے راشدین کے زمانہ میں حضرت سعد کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ کی طرف آنے والے راستوں پر پہرے دار دستے مقرر کیے۔ ایک کے کمانڈر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص تھے، باقی دستوں پر سیدنا علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، عبدالرحمانؓ بن عوف اور عبداللہؓ بن مسعود مقرر تھے۔ مرتدین کی سرکوبی کرنے والی فوجیں مدینہ واپس آئیں تو انھی کمانڈروں نے ان کا استقبال کیا۔ حضرت سعد نے صفوان کی آمد کی بشارت سنائی۔

حیرہ ربیع الاول ۱۲ھ میں خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں فتح ہوا، وہاں کے باشندگان معاہدے سے پھرے تو مثنی نے انھیں دوبارہ زیر کیا، تیسری دفعہ منحرف ہوئے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے فتح حاصل کر کے ان پر ۴ لاکھ سالانہ جزیہ عائد کیا۔

یکم محرم ۱۴ھ کو حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کو مدینہ میں اپنا قائم مقام مقرر کیا اور خود فوج لے کر عراق کا قصد کیا۔ صرار کے مقام پر پہنچ کر انھوں نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ اکثریت نے سفر جاری رکھنے کا مشورہ دیا تاہم عبدالرحمانؓ بن عوف کی رائے تھی، کسی دوسرے جرنیل کو کمان سونپ کر مدینہ لوٹ جائیں۔ اب عمرؓ نے لشکر کی امارت کے لیے صلاح لی، ان کی مشاورت جاری تھی کہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا خط موصول ہوا جس میں حربی اور قائدانہ صلاحیتیں رکھنے والے ایک ہزار شہ سواروں کے انتخاب کی اطلاع دی گئی تھی۔ حضرت سعدؓ اس وقت بنو ہوازن کے صدقات کی وصولی پر مامور تھے اور عمرؓ نے انھیں اس انتخاب کی ذمہ داری بھی سونپ رکھی تھی۔ اس موقع پر عبدالرحمانؓ بن عوف پکار اٹھے، میں نے امیر جیش ڈھونڈ لیا۔ انھوں نے حضرت سعدؓ بن مالک (ابی وقاص) کا نام تجویز کیا۔ وہاں موجود تمام حاضرین کو بھی یہ انتخاب انتہائی موزوں لگا۔ ۱۴ھ (۶۳۵ء) کی ابتدا تھی جب حضرت سعدؓ تین ہزار اہل یمن اور ا ہزار دوسرے مسلمانوں کا لشکر لے کر چلے، عمرؓ انھیں رخصت کرنے کچھ آگے اعوص تک گئے۔ انہوں نے نصیحت کی، سعد! تمھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ماموں اور ان کا صحابی ہونا کسی دھوکے میں نہ ڈالنے پائے اس لیے کہ اللہ

برائی کو برائی سے ختم نہیں کرتا بلکہ برائی کو نیکی ہی کے زور سے مٹاتا ہے۔تم اس اسوہ کو مطمح نظر بنائے رکھنا جس پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آغاز نبوت سے وفات تک قائم رہے۔آنے والے مصائب میں صبر کا دامن تھامے رکھنا۔اللہ سے ڈرتے رہنا،خشیت الٰہی حاصل کرنے کے لیےضروری ہے کہ دنیا سےنفرت کرواورآخرت سے محبت کرو۔عمرؓنے عراق میں پہلے سے موجود جرنیلوں جریر بن عبداللہ اورمثنیٰ بن حارثہ کی فوجوں کوحضرت سعد کے ماتحت کام کرنے کاحکم دیا۔قبل ازیں جریر،مثنیٰ کی ماتحتی قبول کرنے پرآمادہ نہ تھے۔حضرت سعدؓعلیبہ اورخزیمہ کے بیچ واقع صحرائے زرودتک پہنچے تھے کہ مثنیٰ جنگ جسر میں لگے ہوئے زخموں کی تاب نہ لاکرچل بسے۔اب وہ پورے عراق کے گورنراورکمانڈر تھے،شراف پہنچ کرانھوں نے امیرالمومنینؓ کی ہدایت پرمقامی امرااورفوجی دستوں کے کمانڈروں کا تقررکیا۔مثنیٰ کے بھائی معنّیٰ بن حارثہ وہیں آئے اورمثنّیٰ کی ہدایات ان تک پہنچائیں۔مثنیٰ کی بیوہ سلمیٰ ان کے ساتھ تھیں،حضرت سعد نے ان سے نکاح کرلیااورمعنّیٰ لوٹ گئے۔

قادسیہ قدیم ایران کادروازہ تھا،وہاں پہنچنے سے پہلے حضرت سعدؓکوعذیب کامعرکہ پیش آیا،انھوں نے شیرزادکو شکست سے دوچارکیاتوخاصا مال غنیمت ہاتھ آیا۔ایران کے شاہ یزدگرد نے رستم کوجیش اسلامی کا مقابلہ کرنے کے لیے بھیجا۔اس نے ساباط میں رک کر۸۰ ہزار(یا۱لاکھ۲۰ہزار) کی فوج منظّم کی۔مدائن سے قادسیہ پہنچنے میں رستم نے چارماہ لگادیے،جنگ سےاس کے گریزاں ہونے کی وجہ یہ تھی کہ نجومیوں نے اس کی شکست کی خبردی تھی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ مسلمان انتظارسے اکتاکرواپس چلے جائیں۔اس عرصہ کے دوران میں حضرت سعدؓ کسکراورانبار کے مابین واقع نجف،فراض اوردیگرقبائل پرحملے کر کے غلہ،مویشی اور مال غنیمت لاتے رہے،ان کی فوج کی تعداد ۳۰ ہزارسے متجاوز ہوچکی تھی۔جنگ سے پیشترحضرت سعدؓنے امیرالمومنین کےحکم پرایک دعوتی وفد یزدگرد کے پاس بھیجا۔نعمان بن مقرّن،قیس بن زرارہ،اشعث بن قیس،فرات بن حیان،عاصم بن عمر،عمرو بن معدی کرب،مغیرہؓ بن شعبہ،معنیٰ بن حارثہ اورعدی بن سہیل اس میں شامل تھے۔یزدگردحقارت سے پیش آیا،نعمان بن مقرّن نے کہا،ہم دنیاسےشرک و بت پرستی مٹانے آئے ہیں،جواسلام قبول نہیں کرتا،جزیہ اداکر کے ہماری حفاظت میں آ جائے ورنہ تلوار ہمارے اوراس کے درمیان فیصلہ کرے گی۔قیس بن زرارہ نے یہی بات دہرائی تو یزدگردآپے سے باہرہوگیااوردھمکی دی،رستم جلدتمھیں قادسیہ کی خندق میں دفن کردے گا۔اس نے مٹی سے بھری ٹوکری منگوائی اور قائدوفدعاصم کے کندھے پررکھ کردربارسے باہرنکال دیا۔حضرت سعدؓبن ابی وقاص نے اس مٹی کوبھی ایک نیک فال سمجھا،گویاسرزمین ایران ان کے قبضے میں آ گئی ہے۔جنگ سے پیشتر رستم نے حضرت سعدؓکوبات چیت کی

دعوت دی تو انھوں نے ربعیؓ بن عامر کو بھیجا۔ رستم دیبا و قالین کے فرش بچھائے، سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ ربعی نے گھوڑا ایک گاؤ تکیے سے باندھا اور تیر سے قالین چاک کرتے ہوئے تخت پر آن بیٹھے۔ درباریوں نے منع کیا تو انھوں نے خنجر سے قالین کاٹا اور ننگی زمین پر بیٹھ گئے۔ رستم سے کچھ نوک جھونک کے بعد انھوں نے وہی شرائط دہرائیں جو پہلے یزدگرد کو پیش کی جا چکی تھیں۔ رستم کے ساتھی بھڑکے لیکن اس نے ربعی کو اچھی طرح رخصت کیا اور اگلے دن پھر حضرت سعدؓ کو صلح کی گفتگو کا پیغام بھیجا، اب حذیفہ بن محصن گھوڑے پر سوار تخت کے پاس جا پہنچے۔ انھوں نے بھی اسلام، جزیہ یا قتال کی بات کی تو رستم نے انھیں الوداع کہا۔ تیسرے روز رستم ہی کی دعوت پر مغیرہ بن شعبہ سفیر بن کر آئے، انھیں اس نے لالچ دیا اور دھمکایا، دین حق کی دعوت سن کر اس نے پوچھا، اگر ہم اسلام قبول کر لیں تو کیا تم اپنے ملک واپس چلے جاؤ گے؟ انھوں نے کہا، ہاں پھر ہم محض تجارت کی خاطر یا کسی ضرورت کے لیے آئیں گے۔ اس نے اپنے ساتھی جرنیلوں سے مشورہ کیا تو نیا دین قبول کرنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت چلی آ رہی تھی کہ اس طرح کی سفارت کاری تین روز سے زیادہ نہ کی جائے لہٰذا جنگ کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

معرکہ شروع ہونے سے پہلے رستم نے پچھوایا، ہم نہر عتیق عبور کریں یا آپ ادھر آئیں گے؟ حضرت سعد نے ایرانی فوج کو اپنی طرف آنے کی دعوت دی۔ رات کے اندھیرے میں ایرانیوں نے عتیق کو مٹی، نرکل اور اپنے فالتو سامان سے پاٹ دیا اور اسی پر سے فوج، ہاتھی اور دوسرا سامان گزرا۔ اب دونوں فوجیں ایک فیصلہ کن معرکے کے لیے آمنے سامنے تھیں۔ قادسیہ کا معرکہ شروع ہوا تھا کہ حضرت سعد عرق النسا (sciatica) میں مبتلا ہو گئے اور ان کی سرینوں پر زخم نکل آئے۔ گھوڑے پر سوار ہونا ان کے لیے ممکن نہ تھا اس لیے انھوں نے خالد بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ خود سینے کے نیچے تکیہ رکھ کر بیٹھ گئے اور چھت پر سے فوج کی نگرانی کرنے لگے۔ ظہر کی نماز کے بعد حضرت سعد نے جہاد کے مضمون پر مشتمل سورۂ انفال کی آیات کی تلاوت کرائی اور اسلامی فوج سے خطاب کیا۔ انھوں نے تین دفعہ نعرۂ تکبیر بلند کیا تو فوج مستعد (alert) ہو گئی، چوتھی تکبیر پر وہ دشمن کی فوج سے بھڑ گئی۔ حضرت سعد نے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا، دشمن پر ہر حملہ کرتے ہوئے لاحول ولا قوۃ الا باللہ (کسی کو قدرت و طاقت نہیں مگر اللہ ہی کے سہارے) کہیں۔ پہلا دن یوم ارماث تھا۔ غالب بن عبد اللہ نے دو بدو مقابلے میں ہرمز کو قید کیا۔ عاصم بن عمرو اپنے مد مقابل کا پیچھا کرتے ہوئے ایرانی فوج کی صفوں میں گھس گئے۔ عمرو بن معدی کرب نے دعوت مبارزت دینے والے ایرانی کو جہنم رسید کیا۔ ایرانی ہاتھیوں نے زوردار حملہ کیا تو بنو بجیلہ کے گھوڑے بدک

گئے، حضرت سعد نے بنو اسد کو ان کا دفاع کرنے کا حکم دیا اور منادی کرا دی، تیروں کی بوچھاڑ کر کے ہاتھیوں کی یلغار کو روکا جائے اور ان کے ہودوں کے تسمے کاٹ کر سواروں کو گرا دیا جائے چنانچہ شام تک ایسا کوئی ہاتھی نہ رہا تھا جس پر ہودج یا فیل نشین ہو۔ اب دوسرا دن ہوا جسے یوم اغواث کہا جاتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے زخمی فوجیوں کو عورتوں کے سپرد کیا تاکہ وہ ان کی دوادارو کر سکیں۔ شہدا کو عذیب اور عین شمس کے درمیان وادی مشرّق میں دفن کر دیا گیا۔ اسی اثنا میں حضرت عمر کی ہدایت پر شام سے ابوعبیدہ بن جراح کی بھیجی ہوئی کمک کا مقدمہ آن پہنچا، ۱ ہزار گھڑ سواروں کی قیادت قعقاع کر رہے تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو قعقاع ہی نے مبارزت طلب کی۔ پہلے ذوالحاجب پھر فیرزان ان کے ہاتھوں انجام کو پہنچے۔ حارث بن ظبیان نے بندوان کو مارا۔ قعقاع للکارے، مسلمانو! دشمن کو تلواروں پر لے لو تو فوجیں گتھم گتھا ہو گئیں۔ آج بے شمار ایرانی قتل ہوئے کیونکہ وہ ہاتھیوں پر سوار نہ تھے۔ کئی مسلمانوں نے شہادت پائی۔ بنوتمیم کے ایک مسلمان نے رستم کو مارنے کی کوشش کی لیکن خود شہید ہو گیا۔ جنگ نصف شب تک جاری رہی پھر بھی فیصلہ نہ ہو سکا۔ جنگ قادسیہ کا تیسرا دن یوم عماس اس حال میں طلوع ہوا کہ ۲ ہزار مسلمان شہید یا زخمی پڑے ہوئے تھے۔ علی الصبح ان کی تدفین اور علاج معالجہ کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ دوسری طرف ۱۰ ہزار ایرانیوں کی لاشوں سے میدان پٹا پڑا تھا۔ دن چڑھا تو شام سے آنے والی فوج اپنے امیر ہاشم بن عتبہ کی قیادت میں پہنچ گئی۔ جنگ کا بازار گرم ہوا تو اس میں شامل قیس بن مکشوح نے خوب داد شجاعت دی۔ عمرو بن معدی کرب بھی دشمن کی صفوں میں گھس گئے۔ ایرانیوں نے رات بھر محنت کر کے ہاتھیوں کی عماریاں درست کر لی تھیں اور تسموں کی حفاظت کے لیے پیادہ اور گھڑ سوار مقرر کر رکھے تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے ہاتھیوں کو پھر سے روبکار دیکھا تو چھت سے قعقاع اور عاصم کو پیغام بھیجا، ایرانی فوج کے بڑے سفید ہاتھی کا کام تمام کرو۔ دونوں نے ہاتھی کی آنکھ میں نیزے دے مارے تو اس نے اپنے سائس کو پٹک دیا۔ اب قعقاع نے ایک زور کا وار کر کے اسے گرا دیا اور اس کے سواروں کو جہنم رسید کیا۔ حضرت سعد نے حمال اور ربیل کو بھی حکم دیا کہ اپنے مدمقابل خارش زدہ ہاتھی کو سنبھالو۔ انھوں نے اس کی آنکھیں پھوڑ دیں اور ہونٹ کاٹ ڈالا جب کہ ہاتھی کے مہاوت نے خنجر پھینک کر ربیل کو زخمی کر دیا۔ بینائی سے محروم ہاتھی گرتا پڑتا اپنی ہی فوج کی صفیں روندتا ہوا نہر عتیق میں جا گرا۔ اس کے پیچھے باقی ہاتھی بھی اپنے ہودہ نشینوں کو لے کر مدائن کی طرف دوڑے۔ سورج مائل بہ غروب تھا کہ زوروں کی دست بدست جنگ شروع ہوئی جو رات بھر جاری رہی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے طلیحہ اور عمرو کو میدان جنگ کے زیریں حصہ کی نگرانی کے لیے بھیجا کہ کہیں دشمن ادھر سے حملہ نہ کر دے۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر از خود ہی دشمن پر عقبی حملہ کر دیا۔ حضرت سعد نے یہ حکم نہ

دیا تھا تاہم اب انھوں نے اس کارروائی کو جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔قعقاع نے پہل کی ،ان کے پیچھے بنو اسد، بنونخع ، بنوبجیلہ اور کندہ کے دستے کود پڑے۔تلواروں اور زرہوں کے ٹکرانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ بے شمار جانی نقصان ہوا،صبح ہوئی تو کسی فریق کا پلڑا بھاری نہ تھا۔ یہ چوتھی رات تھی جسے لیلۃ الہریر کا نام دیا گیا۔دوپہر تک معرکہ آرائی جاری تھی جب فیرزان اور ہرمزان پسپا ہوئے۔اب ایرانی لشکر کے قلب تک رسائی ممکن ہوگئی تھی۔اسی اثنا میں شدید آندھی اٹھی جس سے ایرانی فوج کے خیمے اکھڑ گئے۔رستم کا تخت گر پڑا،اس کا سائبان اڑ کر عتیق میں جا گرا۔وہ گھبرا کر خچر پر سوار ہوا اور بھاگ نکلا۔قعقاع اور ان کے ساتھیوں نے اس کا پیچھا کیا، ہلال بن علقمہ نے اس پر وار کیا تو وہ نہر عتیق میں کود گیا۔انھوں نے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں اور پیشانی پر تلوار مار کر جہنم رسید کیا۔ضرار بن خطاب نے ایرانی پرچم ''درفش کاویان'' اپنے قبضے میں لے لیا۔ بعد میں یہ ۳۰ ہزار دینار میں بکا۔ایرانی جرنیل جالینوس نے اپنی فوج کو نہر عبور کرنے کا حکم دیا تو مسلمانوں نے بھاگتے ہوئے ایرانیوں پر تیر اندازی شروع کر دی،صرف اس روز ۱۰ ہزار ایرانی کھیت رہے۔۶ ہزار اہل ایمان نے جام شہادت نوش کیا،انھیں وادئ مشرّق کے ساتھ خندق میں سپرد خاک کیا گیا۔ پہلے ۳ دنوں کے شہدا کی تعداد اڑھائی ہزار تھی۔حضرت سعد نے ہلال کو بلا کر رستم کا سارا سامان دے دیا،اس کی مالیت ۷۰ ہزار دینار پڑی۔انہوں نے قعقاع ،شرحبیل اور زہرہ بن حویہ کو مفرور ایرانیوں کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔زہرہ نے جالینوس کا کام تمام کیا،انھیں اس قدر مال غنیمت ملا کہ حضرت سعد کو تامل ہوا اس لیے حضرت عمر سے مشورہ کیا۔انھوں نے جالینوس کی تمام دولت زہرہ بن حویہ تمیمی کو دینے کے ساتھ ان کو عام سپاہیوں سے ۵۰۰ درہم زیادہ دینے کا حکم دیا۔ ہر گھڑسوار کے حصے میں ۶ ہزار درہم آئے، پیادہ کو ۲ ہزار ملے۔مسور بن مخرمہ کو سونے کا ایک آفتابہ ملا جس پر یاقوت جڑے ہوئے تھے۔وہ اسے حضرت سعد کے پاس لے گئے تو انھوں نے یہ مسور کو انھی کے حصے کے طور پر دے دیا۔جب بیچا گیا تو اس کی قیمت ایک لاکھ دینار پڑی۔

حضرت سعد بن ابی وقاص اپنی بیماری کے دوران میں گھر میں مقیم رہے لیکن دروازہ کھلا رکھا۔ان کی نئی بیوی سلمیٰ بنت حفص (خصفہ) کو دشمن کی طرف سے حملے کا اندیشہ ہی رہا۔

حضرت سعد کے گھر میں ایک قیدی ابومحجن ثقفی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں کثرت سے شراب نوشی کرتا تھا۔ایک بار وہ شراب کی مدح میں اشعار گنگنا رہا تھا کہ حضرت سعد نے سن لیے اور اسے قید میں ڈال دیا۔وہ ایک شہ سوار تھا، اس نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی تو اس کا دل بھی جنگ میں حصہ لینے کے لیے مچلنے لگا۔جنگ کے دوسرے روز اس نے حضرت سعد کی اہلیہ سلمیٰ (یا ام ولد زبرا) سے کہا،اس کی بیڑیاں کھول کر حضرت سعد کی گھوڑی بلقا اسے

دے دی جائے تو وہ اختتام دن پر واپس لوٹ آئے گا۔اس نے اس طرح منت کی کہ حضرت سعد کی اہلیہ کا دل پسیج گیااورانھوں نے اسے آزاد کر دیا۔ابو محجن نے اس زور شور سے جنگ میں حصہ لیا کہ چھت سے مشاہدہ کرنے والے حضرت سعد حیران رہ گئے۔وہ بلقا اور ابو محجن کو پہچاننے کی کوشش کرتے رہے لیکن پہچان نہ پائے۔شام کو چھت سے اترے تو اپنی گھوڑی کو پسینے میں ڈوبا پایا۔صحیح قصے کا پتا چلا تو حضرت سعد خوش ہوئے اور ابو محجن کو آزاد کر دیا۔

جنگ قادسیہ کے بعد ایرانی فرار ہو کر ایران کے مختلف اطراف میں بکھر گئے۔مسلمان دو ماہ وہیں مقیم رہے،انھوں نے اپنی تکان اتاری اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے عرق النسا (sciatica) سے افاقہ پایا۔پیشتر اس کے کہ ایرانی کسی جوابی کارروائی کی تدبیر کرتے،عمر فاروق نے سعد کو حکم دیا کہ بچوں اور عورتوں کو قصبۂ عتیق میں چھوڑ کر مدائن کو کوچ کریں۔

مدائن اپنی شان وشوکت میں قدیم ایرانی دارالحکومت بابل پر بہت فوقیت رکھتا تھا،دجلہ اسے اس کے جڑواں شہر بہرہ شیر (بہرسیر یا نہر شیر) سے جدا کرتا تھا۔مدائن کا قدیم یونانی نام طیسفون تھا اور بہرہ شیر سلوقیہ کہلاتا تھا۔یزدگرد کے اجداد نے ان شہروں پر قبضہ کر کے ان کے نام بدل ڈالے تھے۔بغداد ان دونوں کے شمال میں ۲۰ میل کی مسافت پر تھا۔۱۵ھ میں حضرت سعد نے زہرہ بن حویّہ کو مقدمہ کے طور پر آگے بھیجا،زہرہ حیرہ سے ہوتے ہوئے مدائن کو چلے۔بُرس (بیرنمرود) کے مقام پر انھوں نے ایک ایرانی دستے کو شکست دی،وہ بابل کی راہ پر تھے کہ حضرت سعد بھی ان سے آ ملے۔فیرزان کی فوج کو ہزیمت سے دوچار کرنے کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص کچھ دن بابل میں ٹھہرے۔مدائن کی طرف جاتے ہوئے کوثی (جہاں نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو قید کیا تھا) کے مقام پر شہریار کی فوج کو شکست دی۔ادھر زہرہ اور ہاشم بن عتبہ کی سابقہ ملکۂ ایران بوران بنت کسریٰ کے دستے سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس دستے کے سپاہی روزانہ حلف اٹھاتے تھے،جب تک زندگی ہے ملک ایران پر زوال نہ آنے دیں گے۔کسریٰ کا پالتو شیر مقرّط بھی ان کے ساتھ تھا،ہاشم نے لپک کر وار کیا اور تلوار سے شیر کا کام تمام کر دیا۔سپاہیوں نے بھاگ کر بہرہ شیر (بہرسیر) میں پناہ لی۔زہرہ ساباط پہنچے تو وہاں کے شہریوں نے جزیہ کی ادائی مان کر صلح کر لی۔حضرت سعد کے دستوں نے دجلہ وفرات کے مابین کارروائیاں کر کے ایک لاکھ دہقانوں کو قیدی بنا لیا تھا اور ان کے گرد خندقیں کھود دی تھیں۔ان کے سردار شیرزاد نے جزیہ وخراج دینے کی پیش کش کر کے امن کی درخواست کی تو حضرت سعد نے مان لیا،عمرؓ نے ان کے فیصلے کو برقرار رکھا۔اب عرب کی سرحدوں سے لے کر دارالخلافہ مدائن تک تمام ایران خلافت اسلامی کے زیرنگیں ہو چکا تھا اس لیے انھیں عقب سے حملے کا اندیشہ نہ رہا۔ذی الحجہ ۱۵ھ میں اہل بہرہ شیر

(بہرسیر یا نہر شیر) نے مقابلے کا ارادہ کیا تو حضرت سعد نے بات چیت کے لیے سلمان فارسیؓ کو بھیجا لیکن وہ مصر رہے اور منجنیقیں اور جنگی آلات نصب کر لیے۔ حضرت سعد کے حکم پر اسلامی فوج نے بھی ۲۰ منجنیقیں تیار کر لیں۔ دو بدو مقابلے میں ایرانیوں کو ہزیمت اٹھانا پڑی تو وہ قلعہ بند ہو گئے، بہرہ شیر دجلہ پر بنے ہوئے ایک پل کے ذریعے مدائن سے متصل تھا، دہاں سے غذائی اور فوجی امداد کی آمد کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس لیے محاصرہ طول پکڑتا گیا، ۵ ماہ کے اس طویل عرصے میں ایرانی جتھے وقتاً فوقتاً شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں پر حملہ کرتے لیکن مار کھا کر لوٹتے۔ مسلمانوں کی ثابت قدمی دیکھ کر ایرانیوں کا صبر جواب دے گیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان کو مغلوب نہ کر سکیں گے۔ تب شاہ یزدگرد نے حضرت سعد کو پیغام بھیجا کہ دجلہ کو عرب و عجم کے مابین حد فاصل بنا لیا جائے، دریا کے ادھر والا علاقہ مسلمان لے لیں اور اس طرف کا ایرانیوں کے لیے چھوڑ دیں۔ اس صورت حال میں کہ مدائن سامنے تھا اور ایرانیوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے، صلح کرنا مناسب نہ تھا، حضرت سعد نے انکار کر کے فوراً بہرہ شیر (بہرسیر) کا محاصرہ تنگ کر کے اس پر سنگ باری کا حکم دے دیا۔ ادھر سے نیزہ چلا نہ تیر تو فصیل پھلانگ کر شہر کا دروازہ کھولا گیا (صفر ۱۶ھ)۔ شہر میں ایک آدمی کے سوا کوئی نہ تھا، ایرانیوں نے جاتے جاتے دجلہ کا معبد جلا دیا اور کشتیوں کو دریا کے اس پار منتقل کر دیا تھا۔ اب پر شور موجیں مارتا ہوا دریائے دجلہ اسلامی فوج کی پیش قدمی کو روکے ہوئے تھا۔ اس کے دوسری طرف کسریٰ کا سفید محل (قصر ابیض) چمک رہا تھا، اسے نوشیرواں نے ۵۵۰ء میں تعمیر کیا تھا۔ یزدگرد نے مدائن والا کنارہ مضبوط بنا کر مسلمان فوج کی آمد مستقل طور پر روکنے کی تدبیریں سوچیں لیکن کوئی راہ نہ پا کر فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

اس پار عزم و ہمت سے محروم ایک قوم تھی جس کا قائد اسے چھوڑ کر جا رہا تھا اور اسے کامیابی کی کوئی توقع نہ تھی۔ ادھر ایمان و یقین سے پر، فتح کے لیے بے تاب مسلمانوں کے قائد حضرت سعد بن ابی وقاص دجلہ کنارے کھڑے اسے عبور کرنے کی فکر میں تھے۔ انھیں یہی ترکیب سوجھی کہ کچھ لوگ دریا پار کر کے دوسرے کنارے تک جائیں اور وہاں کھڑے ہوئے ایرانیوں کو ہٹائیں تا کہ باقی لشکر دریا عبور کر سکے۔ عاصم بن عمرو نے ان کی تجویز پر لبیک کہنے میں سبقت کی، ۶۰۰ رضا کاران کے ہم آواز تھے۔ حضرت سعد نے عاصم کو ان کا قائد مقرر کیا، انھوں نے اپنے ساتھ آگے لے جانے کے لیے ۶۰ گھڑ سوار چنے اور گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ دوسرے کنارے پر کھڑے ایرانی پکار اٹھے، یہ دیوانے ہیں یا جن؟ انھوں نے بھی اپنے گھوڑے پانی میں اتارے اور آنے والے مسلمانوں کو روکنے کے لیے تیر اندازی شروع کر دی۔ ادھر عاصم نے اپنے دستے کو تیر برسانے کا حکم دیا اور کہا، گھوڑوں کی آنکھوں کو نشانہ بنایا

جائے۔ ایسا ہوا تو گھوڑے اپنے سواروں کو دجلہ میں گراتے ہوئے واپس دوڑے۔ سابقین کا یہ دستہ دوسرے کنارے پہنچا تو وہاں کھڑے ایرانیوں کو پرے دھکیل دیا۔ اب ۶۰۰ میں سے باقی سوار بھی پانی میں کود پڑے۔ عاصم کا ''خطروں میں کودنے والا دستہ (کتیبۃ الاہوال)'' دجلہ کے وسط میں پہنچا تو قعقاع بن عمرو کی کمان میں شامل شہ سواروں نے بھی موجیں مارتے دریا میں چھلانگیں لگا دیں، اسے ''خاموش دستے (کتیبۃ الخرساء)'' کا نام دیا گیا۔ عاصم کے سپاہیوں نے ایرانیوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا، جب قعقاع اور ان کے ساتھی پار اترے تو کنار دریا خالی تھا۔ اب حضرت سعد نے تمام سواروں کو دریا میں کودنے کا حکم دیا، انھوں نے سپاہیوں کو تلقین کی، نستعین باللہ و نتوکل علیہ، حسبنا اللہ ونعم الوکیل (ہم اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور اسی پر بھروسا کرتے ہیں۔ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ خوب کارساز ہے) کی دعا مانگتے جائیں۔ دجلہ اسلامی لشکر سے پر ہو گیا، سطح آب پر پانی نہیں بلکہ گھوڑوں اور گھڑسواروں کے سر نظر آ رہے تھے۔ مسلمانوں نے اطمینان وسکون سے باتیں کرتے ہوئے دریا پار کیا۔ آخر میں پار سے کشتیاں لا کر پیادوں اور ساز وسامان کو منتقل کیا گیا۔ اس سارے معرکے میں صرف ایک مسلمان گھوڑے سے پھسل کر دریا میں گرا۔ اسے قعقاع نے واپس گھوڑے پر بٹھا دیا۔ اشیا میں سے صرف لکڑی کا ایک پیالہ کھویا گیا جو مالک بن عامر کا تھا۔ اسے دجلہ کی موج نے اگلے کنارے پر پھینک دیا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اگر ۱۴ویں صدی عیسوی میں تیمور لنگ نے اسی طرح دجلہ عبور نہ کیا ہوتا تو شاید مستشرقین کو یہ واقعہ ماننے میں بھی تامل ہوتا۔ اسلامی فوج کے پہنچنے سے پہلے شاہ ایران اپنے خزانے سمیٹ کر، اہل وعیال اور غلاموں باندیوں کے قافلے کے ساتھ حلوان کو روانہ ہو چکا تھا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے سلمان فارسیؓ سے کہا، قصر ابیض کے باشندگان کو فارسی میں آواز دیں۔ تین دن تک انھیں پکارا گیا لیکن کوئی جواب نہ ملا، تیسرے دن حضرت سعد ساسانیوں کے اس محل میں داخل ہو گئے جہاں ۳۰ کھرب دینار کا خزانہ، تحائف اور آرائش وزیبائش کا سامان تھا۔ انھوں نے ۸ رکعت نماز فتح ادا کی اور شاہی ایوان کو مسجد میں تبدیل کر دیا۔ صفر ۱۶ھ میں انھوں نے یہاں جمعہ پڑھایا جو سرزمین عراق میں ادا کیا جانے والا پہلا جمعہ تھا۔ انھوں نے وہاں قیام کی نیت کر لی تھی۔ یزدگرد کو پکڑنے کے لیے حضرت سعد نے ایک رسالہ روانہ کیا، بادشاہ تو ان کے ہاتھ نہ آیا البتہ وہ قافلے کے کچھ افراد اور شاہی خزانہ لے آئے، خسروی تاج اور خلعتیں بھی ان کے ہاتھ لگیں۔ حضرت سعد نے عمرو بن عمرو بن مقرن کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ

قصر ابیض اور مدائن کے محلات سے مال غنیمت اکٹھا کریں۔ اس طرح کے مواقع پر فاتح لشکر کے سپاہی لوٹ مار کرتے ہیں اور اپنی جیبیں خوب بھرتے ہیں، دنیا کو حیرت ہو گی کہ ایسا ایک واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو کہنا پڑا، اگر اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی فوقیت کا فیصلہ نہ فرمایا ہوتا تو میں کہتا، یہ فوجی بدریوں جیسی فضیلت رکھتے ہیں۔ جنگ ردہ میں مرتدین کی سربراہی اور پھر ارتداد سے توبہ کرنے والے طلیحہ، عمرو بن معدی کرب اور قیس بن مکشوح اس معرکے میں بھی شریک تھے۔ حضرت سعد کے حکم سے سلمان فارسیؓ نے مال غنیمت کے ۵ حصے کر کے خمس الگ کیا۔ سپاہیوں میں تقسیم سلیمان باہلی نے کی۔ ۶۰ ہزار گھڑسواروں نے اس جہاد میں حصہ لیا تھا، ہر ایک کے حصے میں ۱۲ ہزار دینار آئے۔ حضرت سعد نے مدائن کے خالی گھر بھی فوجیوں میں بانٹ دیے، ان میں سے کچھ نے اپنے بال بچے حیرہ اور دوسرے شہروں سے لا کر ان گھروں میں بسا دیے۔ بشیر بن خصاصیہ خمس اور خسروی غنائم کو لے کر مدینہ پہنچے۔ حضرت سعد نے اہل لشکر کی اجازت سے وہ بیش قیمت ریشمی شاہی قالین بھی اس میں شامل کر دیا تھا جس پر سونے، موتیوں اور جواہرات سے ایران کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ سیدنا عمر نے شاہی لباس سامنے رکھ کر حاضرین کی طرف دیکھا۔ جسامت اور قامت کے اعتبار سے ان کو سراقہؓ بن مالک ہی اس کے لیے موزوں لگے۔ سراقہؓ نے کسریٰ کا کرتہ، پاجامہ پہنا، قبا اوڑھی، ہاتھوں میں کنگن پہنے اور سر پر شاہی تاج رکھ لیا۔ انھوں نے ایران کے آخری تاج دار کے موزے پہنے، کمر بند باندھا اور اس کی تلوار حمائل کر لی۔ عمر نے کہا، واہ وا! بنو مدلج کا دیہاتی خسروانہ لباس زیب تن کیے ہوئے ہے۔ یوں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی جو آپؐ نے ہجرت مدینہ کے وقت فرمائی تھی۔ پھر امیر المومنین نے اہل مدینہ میں خمس تقسیم کیا اور قالین کے بارے میں صحابہ سے رائے لی۔ علی نے کہا، اگر آپ نے قالین کو اسی شکل میں برقرار رکھا تو کل کلاں کوئی شخص استحقاق کے بغیر ہی اس کا مالک بن بیٹھے گا۔ انھوں نے فی الفور اس قیمتی قالین کے پرزے پرزے کر کے لوگوں میں بانٹ دیے۔ علیؓ کے حصے میں آیا ہوا معمولی ٹکڑا ۲۰ ہزار دینار میں بکا۔

ادھر ایوان کسریٰ میں اذان و اقامت کی آوازیں بلند ہوتیں، حضرت سعد امامت کراتے اور لوگوں کو وعظ کہتے۔ انھوں نے ایرانیوں سے مزید جنگ کرنے کی کوئی پلاننگ نہ کی کیوں کہ خلیفۂ ثانی کی طرف سے ایسا کوئی حکم نہ ملا نہ تھا البتہ اپنے جاسوسوں کے ذریعے سے ایران کی بھگوڑی قوت مقتدرہ کی کھوج میں رہتے۔ انھوں معلوم ہوا، حلوان جاتے ہوئے ایران کے اطراف واکناف سے بے شمار فوجی اور جنگ یزدگرد کے ساتھ آ ملے ہیں اور اس نے مہران کو کمانڈر مقرر کر کے اس نئی فوج کو مدائن سے ۶۵ کلومیٹر دور جلولا کے قلعہ نما شہر میں بھیج دیا ہے۔ قادسیہ میں

مسلمانوں کے ہاتھ ہلاک ہونے والے ایرانی جرنیل رستم کا بھائی خرزاد بن فرخ زاد بھی وہاں جنگی تیاریوں میں مشغول ہے۔اس نے جلولا کے گرد خندق کھدا کر اس کے گرد لوہے کی خاردار تار نصب کرا دی ہے اور شہر کو آنے والے تمام راستوں پر کانٹے (گوکھرو یا بھگھڑے کے خار) بچھوا دیے ہیں۔ ہر طرح کے ہتھیار اور کیل کانٹے سے لیس ایک نیا لشکر تیار ہوا چاہتا ہے۔ایرانی اس فوجی اجتماع سے بڑی توقعات وابستہ کیے ہوئے ہیں۔حضرت سعد بن ابی وقاص نے عمر فاروقؓ سے ہدایات مانگیں تو ان کا حکم آیا، اپنے بھتیجے ہاشم بن عتبہ کو ۱۲ ہزار کی فوج دے کر جلولا روانہ کر دو۔ہاشم نے جلولا کا محاصرہ کر لیا جو اڑھائی ماہ جاری رہا، اس دوران میں کسریٰ اور حضرت سعد اپنی اپنی فوج کو کمک بھیجتے رہے۔ایک روز ایسی شدید آندھی اٹھی کہ اندھیرا چھا گیا۔اسی دوران میں کچھ ایرانی گھڑسوار خندق میں گر پڑے، انھیں نکالنے کے لیے راستہ بنایا گیا تو مسلمانوں نے یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے زوردار حملہ کر دیا۔ہاشم نے جوشیلے وعظ سے فوج کو گرمایا اور قعقاع نے زبردست یلغار کر کے خندق کا راستہ کھول دیا۔ایک لاکھ ایرانی مارے گئے باقیوں نے راہ فرار پکڑی۔یہ فتح جسے فتح الفتوح کہا جاتا ہے، ذی قعد ۱۶ھ میں ہوئی، اس میں ۳۰ کروڑ کا مال غنیمت حاصل ہوا۔حضرت سعد نے زیاد بن ابوسفیان کے ہاتھ خمس مدینہ روانہ کیا۔حلوان بھی قعقاع نے فتح کیا۔ہاشم جلولا میں اور قعقاع حلوان میں ٹھہرے جب کہ حضرت سعد کوفہ روانہ ہو گئے۔انھیں فرات کے کنارے پر واقع شہر ہیت میں فوجوں کے اجتماع کا پتا چلا تو خلیفۂ ثانی کی اجازت سے عمر بن مالک کی کمان میں ایک لشکر وہاں بھیجا۔ہیت والوں نے ہتھیار ڈالے تو حضرت سعد نے ضرار بن خطاب کی سربراہی میں ایک لشکر ایران وعراق کے سرحدی شہر ماسبذان روانہ کیا جہاں ایرانیوں کو شکست ہوئی۔حضرت سعد نے امیر المومنین سے ملک ایران میں مزید پیش قدمی کی اجازت بھی مانگی تو جواب آیا، مسلمانوں نے ایران وعراق میں پیہم صعوبتیں برداشت کی ہیں، چند روز اپنے لشکر کو آرام کرنے کا موقع دو۔حضرت عمر نے ایران وعراق کی مفتوحہ زمینوں کی خرید وفروخت روک دی تا کہ مسلم فاتحین میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو جائے چنانچہ یہ کسانوں کے پاس رہیں اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے انھیں ذمی قرار دیا۔شاہی زمینوں اور جنگ میں حصہ لینے والے امرا کی زمینوں کو خلافت اسلامی کی ملکیت قرار دیا گیا۔

محرم ۱۷ھ میں حضرت سعد بن ابی وقاص مدائن سے کوفہ منتقل ہوئے۔سبب یہ ہوا کہ صحابہ کو مدائن کی آب و ہوا موافق نہ آئی۔مکھیوں، مچھروں اور گرد وغبار سے ان کے رنگ سیاہ اور بدن کم زور پڑ گئے۔یہ اطلاع حذیفہ بن یمان اور حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر کو دی، انہوں نے خود بھی مدینہ پہنچنے والے وفود سے مل کر اس کا اندازہ لگایا تو حضرت سعد کو خط لکھا، عربوں کو وہی آب و ہوا بھائے گی جو ان کے اونٹوں کے لیے سازگار ہو یعنی دریا سے

دور خشک زمین جہاں پانی کا چشمہ ہو۔حضرت سعد نے حذیفہ اور سلمان بن زیاد کو موزوں جگہ کی تلاش کے لیے بھیجا۔ انھوں کوفہ کی سرخ ریت والی پتھریلی زمین پسند آئی۔ابن جریر کے مطابق ابن بُقیلہ نے ان کی راہ نمائی کی اور کہا، میں آپ کو ایسی جگہ کی نشان دہی کرتا ہوں جو کھٹملوں کے لیے بلند ہے اور بیابان کے نشیب میں ہے۔تب وہاں ریت کی تین خانقاہیں اور کچھ جھونپڑیاں تھیں۔حذیفہ اور سلمان نے اس جگہ نماز ادا کی اور نئے شہر کے لیے برکت و ثبات کی دعا مانگی۔سب سے پہلے بلند ترین جگہ کی نشان دہی کر کے مسجد تعمیر کی گئی۔خسروی محلات سے حاصل شدہ سنگ مرمر کے ستونوں سے مسجد کی دوسو ہاتھ بلند چھت کھڑی کی گئی اور ایک خندق کے ذریعے اس کی حدود مقرر کی گئیں۔پھر حضرت سعد نے دور تک مار کرنے والا ایک ماہر تیر انداز بلایا جس نے مسجد کی چہار اطراف میں تیر پھینکے۔تیر گرنے کے مقامات تک کی جگہ بازار کے لیے چھوڑی گئی اور اس سے پرے عوام الناس نے گھر بنا لیے۔حضرت سعد نے ۷ سے لے کر ۴۰ گز تک کی گلی چھوڑنا لازم قرار دیا۔پہلی تعمیرات بانس سے ہوئیں جو امسال ہی جل کر راکھ ہوئیں تو حضرت عمر نے اس شرط پر پکی اینٹوں کے گھر بنانے کی اجازت دی کہ کمرے تین سے زیادہ اور چھت بہت بلند نہ ہو۔ایرانی معمار روزبہ نے ایران کے شاہی محلات میں استعمال ہونے والی اینٹوں سے ''قصر حضرت سعد'' (قصر کوفہ) تعمیر کیا۔پڑوس میں مسجد اور بیت المال تھے،ادھر فوجیوں کی کالونی بن گئی۔اب حضرت سعد نے امیر المومنین کو مطلع کیا، میں نے حیرہ و فرات کے بیچ کوفہ میں قیام کر لیا ہے۔مسلمان کوفہ و مدائن میں سے جس شہر میں چاہیں، رہ سکتے ہیں۔کچھ عرصہ گزرا تو فوجیوں کی صحتیں بحال ہو گئیں۔حضرت سعد دفتر میں بیٹھتے تو بازار میں لوگوں کے غوغا سے گھبرا کر دروازہ بند کرا دیتے۔حضرت عمر کو خبر ہوئی تو محمد بن مسلمہ کو کوفہ بھیجا اور کہا، وہاں پہنچتے ہی لکڑیاں جمع کرنا اور محل کا دروازہ جلا دینا،حضرت سعد کو یہ حکم بھی سنانا، دروازہ بند کر کے نہ لوگوں کو روکنے کے لیے دربان بٹھائے۔

۱۷ھ میں رومیوں نے ابوعبیدہ بن جراح کو حمص میں محصور کر دیا تو عمر نےحضرت سعد کو حکم دیا،قعقاع کی قیادت میں انھیں کمک بھیجیں۔وہ خود بھی مدینہ سے فوج لے کر ان کی مدد کے لیے نکلے، جابیہ تک پہنچے تھے کہ خبر ملی، ابوعبیدہ نے حصار توڑ کر فتح حاصل کر لی ہے۔۱۷ھ ہی میں حضرت عمر نے حضرت سعد کو خط لکھا،شام و عراق کی فتح مکمل ہونے کے بعد ایک لشکر الجزیرہ روانہ کر دینا۔اسی سال انھوں نے امیر المومنین کے حکم پر نعمان بن مقرن کی قیادت میں ایک لشکر اہواز بھیجا جس میں جریر بن عبداللہ بجلی، جریر بن عبداللہ حمیری اور سوید بن مقرن بھی شامل تھے۔یہ ہرمزان کے خلاف لڑنے والی اسلامی فوج میں شامل ہوا۔

کوفہ کے بعد ۱۸ھ میں بصرہ کی تعمیر ہوئی، اس کے لیے ابلّہ کے قریب دجلہ و فرات کے ڈیلٹا کا انتخاب کیا گیا، یہیں سے یہ دونوں دریا خلیج فارس میں گرتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضرت عمر کے حکم پر ۱۶ھ میں عتبہ بن غزوان کو بصرہ کی بنا رکھنے کی ذمہ داری سونپی۔ ابن جریر اور بلاذری کا خیال ہے، عمر نے عتبہ کو ۱۴ھ میں کوفہ آباد ہونے سے پہلے بصرہ بسانے کے لیے بھیجا۔

۲۰ھ (۶۴۰ء) میں کوفہ کے کچھ لوگوں نے امیر المومنین سے حضرت سعد بن ابی وقاص کی برائیاں کیں حتیٰ کہ ان کو لکھ بھیجا، وہ نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھاتے۔ جراح بن سنان اسدی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ عمر نے کہا، تمھارے خلاف یہی دلیل کافی ہے کہ تم حضرت سعد کے خلاف اس وقت اٹھ کھڑے ہوئے ہو جب وہ اللہ کے دشمنوں سے جہاد کرنے میں مشغول ہے (تب جنگ نہاوند کی تیاری تھی)، اس کے باوجود میں تمھاری شکایات کا کھوج لگاؤں گا۔ انھوں نے محمد بن مسلمہ کو کوفہ بھیجا جو تمام قبائل و مساجد میں گھومے۔ سب نے حضرت سعد کے بارے میں کلمۂ خیر کہا۔ جراح کے محلّہ کے لوگ خاموش رہے، برا بھلا کچھ نہ کہا۔ بنوعبس کے اسامہ بن قتادہ (ابوسعدہ) نے کہا، حضرت سعد جنگ میں حصہ نہیں لیتے، رعایا سے ایک جیسا سلوک نہیں کرتے اور مال غنیمت انصاف سے نہیں بانٹتے۔ حضرت سعد نے کہا، اللہ! اگر اس نے جھوٹ کہا ہے تو اس کی بینائی زائل کر، اس کا کنبہ بڑا کر اور اسے فتنوں میں مبتلا کر دے۔ یہ دعا بعد ازاں اسی طرح پوری ہوئی۔ اب سعد، محمد، جراح اور اس کے ساتھی مدینہ پہنچے۔ حضرت عمر نے پوچھا، ابواسحاق! (حضرت سعد کی کنیت) یہ لوگ بتا رہے ہیں، تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھاتے؟ حضرت سعد نے جواب دیا، واللہ! میں انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی نماز پڑھاتا ہوں، اس میں کوئی کمی نہیں کرتا۔ (مثال کے طور پر) عشا کی نماز پڑھاؤں تو پہلی دو رکعتیں ٹھہر ٹھہر کر پڑھاتا ہوں اور آخری دو رکعتوں میں جلدی کرتا ہوں۔ عمر نے کہا، ابواسحاق! تمھارے بارے میں میرا یہی گمان تھا۔ (بخاری: ۷۵۵، مسلم: ۹۴۸) یہ ثابت ہونے کے باوجود کہ حضرت سعد سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، عمر نے انھیں معزول کرنا مناسب سمجھا۔ انھوں نے پوچھا، کسے قائم مقام مقرر کر آئے ہو؟ حضرت سعد نے بتایا، عبداللہ بن عبداللہ بن عتبان کو۔ انھی کو قائم مقام گورنر بنانے کے بعد عمر نے جھوٹی شکایت کرنے پر شکایت کنندگان کو تہدید کی۔ مدینہ پہنچنے سے پہلے حضرت سعد امیر المومنین کو نہاوند میں ڈیڑھ لاکھ ایرانی فوجوں کے اجتماع کی خبر دے چکے تھے۔ عبداللہ نے گورنر بننے کے بعد ایرانیوں پر حملے کی اجازت مانگی تو اس مہم کی کمان نعمان بن مقرن کو مل گئی۔ حضرت سعد ساڑھے تین سال کوفہ کے گورنر رہے، ان کے بعد عمار بن یاسر اور پھر مغیرہ بن شعبہ نے یہ ذمہ داری سنبھالی۔ ۲۳ھ میں عمر نے حضرت سعد کو بحال کرنا چاہا لیکن وہ نہ مانے اور

کہا، میں ان لوگوں کا والی کیسے بن سکتا ہوں جن کا خیال ہے کہ میں نماز بھی درست نہیں پڑھاتا۔اسی سال عمر کی شہادت کا سانحہ پیش آ گیا۔انہوں نے وصیت کی ،اگر حضرت سعد کوفہ کے گورنر بن جائیں تو خوب ورنہ اس عہدے پر فائز شخص ان سے مدد ضرور لے۔میں نے انہیں کسی کوتاہی یا خیانت کے باعث معزول نہ کیا تھا۔

حضرت عمر کی وصیت تھی ،نیا خلیفہ عشرۂ مبشرہ میں شامل ان چھ اصحاب رسولؐ میں سے منتخب کیا جائے ،عثمانبن عفان،علیبن ابوطالب ،زبیر بن عوام،طلحہ بن عبیداللہ،حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبدالرحمان بن عوف۔حضرت سعد بن ابی وقاص کا نام لیتے ہوئے انہوں نے کہا،اگر آپ لوگوں نے حضرت سعد کو چنا تو (یہ انتخاب درست ہوگا کیونکہ) وہ اس منصب کے پوری طرح اہل ہیں، میں نے ان کوکسی قصور یا خیانت کی وجہ سے معزول نہ کیا تھا۔ امیرالمومنین کی شہادت کے بعد ان کی مقرر کردہ شوریٰ کا اجلاس ابوطلحہ انصاری کے پہرے میں شروع ہوا ۔عبدالرحمان بن عوف نے ۳ ارکان کو۳ ارکان کے حق میں دست بردار ہونے کا مشورہ دیا تو حضرت سعد عبدالرحمانکے حق میں دست بردار ہوگئے ۔اب عبدالرحمان نے علی وعثمان میں سے ایک کا انتخاب کرنے کو کہا تو حضرت سعد نے عثمان کے حق میں رائے دی۔عمر نے ہدایت کی تھی ،خلیفہ کے انتخاب سے پہلے اصحاب شوریٰ کے علاوہ کسی کو اجلاس میں نہ آنے دیا جائے۔جب عمرو بن عاص اور مغیرہ بن شعبہ آ کر دروازے کے پاس بیٹھے تو حضرت سعد نے انہیں ڈانٹ دیا۔خلیفۂ ثالث کے انتخاب میں کچھ وقت لگا تو حضرت سعد نے عبدالرحمان سے کہا ،جلد فیصلہ کردو،قبل اس کہ لوگ کسی فتنے میں مبتلا ہوجائیں۔

عبیداللہ بن عمر نے غصے میں آ کر اپنے والد کی شہادت کی سازش میں ملوث افراد ہرمزان اور جفینہ کوقتل کر دیا تو حضرت سعد بن ابی وقاص نے ان کی تلوار قبضے میں لے لی اور انہیں پکڑ کر اپنے گھر میں قید کر دیا۔جب حضرت عثمان کی بیعت ہو چکی تو ان کے سامنے پیش کر دیا،انہوں نے اہل رائے کے مشورے سے چھوڑ نا مناسب سمجھا۔

۲۴ھ (۶۴۵ء) میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان نے مغیرہ بن شعبہ کو ہٹا کر حضرت سعد کو دوسری بار کوفہ کا گورنر مقرر کیا۔ان کی تعیناتی کا محرک حضرت عمر کے وہ مدحیہ کلمات بنے جو انہوں نے شہادت سے قبل حضرت سعد کے بارے ارشاد فرمائے۔وہ ڈیڑھ سال تک اس عہدے پر فائز رہنے پائے تھے کہ ۲۵ھ میں خلیفۂ سوم نے انہیں معزول کر کے ولید بن عقبہ کو گورنر بنا دیا۔ان کی معزولی کا سبب یہ ہوا کہ انہوں نے بیت المال سے کچھ قرض لیا جو وہ مقررہ وقت پر ادا نہ کر سکے۔عبداللہ بن مسعود خزانچی تھے،انہوں نے تقاضا کیا تو دونوں صحابیوں میں سخت کلامی ہوئی پھر آس پاس کے لوگ بھی اس جھگڑے میں شامل ہوگئے ۔حضرت عثمانکو علم ہوا تو انہوں نے حضرت سعد کو ہٹا دیا جب کہ ابن مسعود

کوان کے عہدے پر برقرار رکھا۔حضرت سعد کی امارت کے دوران میں ان کے بیٹے عمیر زخمی ہو کر شدید بیمار ہوئے تو بھی انھیں مدینہ آنا پڑا،سیدنا عثمان نے تب ان کے اختیارات معاویہ کو سونپے۔

حضرت عثمان پر اقربا نوازی کا الزام لگا تو انھوں نے علی،طلحہ،سعد،زبیر اور معاویہ کو بلا کر اپنی پالیسی کی وضاحت کی۔انھوں نے کہا،میرے پیش رو ابوبکر و عمر سختی سے کام لیتے تھے جب کہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو سامنے رکھ کر اپنے اہل قرابت کو دیتا ہوں کیونکہ وہ تنگ دست ہیں۔اس کے باوجود ان اصحاب رسولؐ کے اعتراض پر عثمان نے مروان کو دیے جانے والے ۱۵ ہزار درہم اور عبداللہ بن خالد بن اسید کو عطا کردہ ۱۰ ہزار واپس لیے۔عہد عثمانی کے آخری دنوں میں بلوائیوں نے مدینہ پر یورش کی۔اس موقع پر حضرت عثمان نے حضرت علی سے درخواست کی کہ ان سرکشوں سے بات چیت کریں۔وہ ۱۳۰ اکابر صحابہ کی جماعت لے کر نکلے اور عمار بن یاسر کو بھی ساتھ چلنے کو کہا لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔تب عثمان نے حضرت سعد بن ابی وقاص کی ذمہ داری لگائی کہ انھیں جانے پر آمادہ کریں لیکن عمار تب بھی نہ مانے۔مسجد نبویؐ میں حضرت عثمان پر سنگ باری کی گئی تو حضرت سعد،حسین،زید اور ابو ہریرہ نے باغیوں سے قتال کرنا چاہا مگر حضرت عثمان نے منع کر دیا۔بلوائیوں کے فساد پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت سعد نے کہا،رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،جلد ہی ایسا فتنہ برپا ہو گا جس میں بیٹھا ہوا کھڑے ہوئے سے،کھڑا ہوا چلتے ہوئے سے اور چلتا ہوا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا۔حدیث کے راوی بُسر بن سعید نے پوچھا، اگر کوئی میرے گھر میں داخل ہو کر مجھے قتل کرنے کے درپے ہو جائے تو؟ حضرت سعد نے کہا،آدم کے اچھے بیٹے (ہابیل) کی مانند ہو جانا۔(ترمذی:۲۱۹۴،مسند احمد:۱۶۰۹) فتنہ کی سنگینی کا احساس ہونے کے باوجود حضرت سعد کا خیال تھا کہ باغی عثمان کو شہید کرنے کی جرات نہ کریں گے۔محاصرے کے دوران میں سیدنا عثمان نے کئی بار علی،سعد، طلحہ اور زبیر کو گواہ بنا کر اسلام کے لیے کی گئی اپنی نیکیاں گنوائیں تو ان سب نے ان کی تائید کی۔شہید مظلوم سیدنا عثمان کی شہادت کے ۵ دن بعد تک مدینہ میں بدبخت غافقی بن حرب کے احکام چلتے رہے۔اس دوران میں مصر کے باغی حضرت علی کو بیعت لینے پر آمادہ کرتے رہے،کوفی زبیر بن عوام کو تلاش کرتے رہے اور بصری طلحہ کو خلیفہ بنانے پر کوشاں رہے۔ایک گروہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے پاس بھی گیا لیکن انھوں نے یہ ذمہ داری سنبھالنے سے انکار کر دیا پھر وہ مدینہ سے باہر چلے گئے۔

محمد عمار خان ناصر

قتال اور دین کے معاملے میں جبر واکراہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۷)

(گذشتہ سے پیوستہ)

گزشتہ صفحات میں ہم نے قرآن مجید اور حدیث وسیرت کی روشنی میں عہد نبوی میں جہاد وقتال کی نوعیت پر تفصیلی گفتگو کی ہے جو ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا جہاد صرف دفاعی نہیں بلکہ جارحانہ اور اقدامی بھی تھا اور اس کا محرک صرف کفار کے فتنہ وفساد کا خاتمہ نہیں بلکہ ان کو دائرۂ اسلام میں لانا یا ان کو مغلوب کر کے ان پر اسلام اور اہل اسلام کی بالا دستی قائم کرنا بھی تھا۔ تاہم یہ بحث تشنہ رہے گی اگر ان استدلالات وشبہات کا سنجیدگی سے جائزہ نہ لیا جائے اس اس حوالے سے بالعموم پیش کیے جاتے ہیں۔

اس ضمن میں اصولی نوعیت کا ایک بنیادی استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جہاں تک جہاد وقتال کی پہلی صورت کا تعلق ہے تو اس کے جواز پر عقلی واخلاقی لحاظ سے کوئی سنجیدہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ ظلم وعدوان اور جارحیت کے خاتمے اور اپنی جان ومال اور سرزمین کے دفاع کے لیے برسر جنگ ہونے کو، بعض راہبانہ اور غیر عملی فلسفوں سے قطع نظر، دنیا بھر میں ہمیشہ جائز بلکہ بعض حالات میں واجب سمجھا گیا ہے۔ البتہ دوسری صورت، جس میں کسی گروہ کی طرف سے کی جانے والی جارحیت یا ظالمانہ اقدام کی بنا پر نہیں بلکہ کفر پر قائم رہنے کی پاداش میں کفار

ومشرکین کو قتل کرنے یا انھیں محکوم ومغلوب بنانے کے لیے تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے، اپنے ظاہر کے لحاظ سے خود دین وشریعت ہی کے نصوص میں بیان ہونے والی ان ہدایات کے ساتھ ٹکراتا اور ان کی نفی کرتی ہے جن میں دین ومذہب کے معاملے میں انسان کے ارادۂ واختیار کی آزادی کی اہمیت اجاگر کی گئی اور اس حوالے سے کسی قسم کے جبر واکراہ کو اللہ تعالیٰ کی اسکیم کے منافی قرار دیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں امتحان اور آزمایش کے لیے بھیجا ہے اور اس مقصد کے لیے اسے حق کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں پوری آزادی بخشی ہے۔ ارادہ و اختیار کی یہ آزادی دنیا میں رشد وہدایت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی اسکیم کا بنیادی ضابطہ ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں کسی قسم کے جبر واکراہ کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ ارشاد ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِيُ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنُ يَكْفُرُ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيُعٌ عَلِيُمٌ. (البقرہ۲:۲۵۶)

’’دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔ یقیناً ہدایت کا راستہ گمراہی کے راستے سے ممتاز ہو چکا ہے۔ سو جو طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک نہایت مضبوط رسی تھام لی جو ٹوٹنے والی نہیں۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔‘‘

قرآن مجید کی رو سے ایمان کے معاملے میں اصل اعتبار انسان کے اپنے ارادۂ واختیار کا ہے۔ چنانچہ کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس معاملے میں کسی دوسرے انسان کو جبر واکراہ کے ساتھ ایمان واسلام کی راہ پر لانے کی کوشش کرے اور نہ اس طرح کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل ہے:

وَلَوُ شَاءَ رَبُّكَ لآمَنَ مَن فِيُ الْأَرْضِ كُلُّهُمُ جَمِيُعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِيُنَ ـ وَمَا كَانَ لِنَفُسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذُنِ اللّٰهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيُنَ لَا يَعْقِلُونَ. (یونس۱۰:۹۹، ۱۰۰)

’’اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین پر بسنے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا تم لوگوں کو مجبور کرنا چاہتے ہو تا کہ وہ ایمان لے آئیں؟ اور کسی انسان کے بس میں یہ نہیں کہ وہ اللہ کے اذن کے بغیر ایمان لے آئے۔ (اللہ اس کی توفیق ان کو دیتا ہے جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں) اور جو لوگ اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتے، ان پر (کفر وشرک) کی گندگی مسلط کر دیتا ہے۔‘‘

ارادہ و اختیار کی اسی آزادی کی بنا پر انسانوں کا مختلف مذہبی گروہوں میں تقسیم رہنا اللہ تعالیٰ کے قانون آزمایش کا ایک لازمی تقاضا ہے، اور ان اختلافات کا حتمی فیصلہ خود اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کریں گے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلَوُ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلاَ يَزَالُونَ مُخُتَلِفِينَ ـ إِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذَلِكَ خَلَقَهُمُ وَتَمَّتُ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمُلأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الُجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجُمَعِينَ. (ہود ۱۱: ۱۱۸، ۱۱۹)

''اور اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو (دین و مذہب کے لحاظ سے) ایک ہی گروہ بنا دیتا، لیکن یہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے، سوائے ان کے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو۔ اور اللہ نے انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے۔ اور تیرے رب کا یہ فیصلہ پورا ہو کر رہے گا کہ میں جہنم کو جن اور انسان، دونوں مخلوقوں سے بھر دوں گا۔''

جن لوگوں کو حق کی روشنی میسر آ جائے، ان کی ذمہ داری بس یہ ہے کہ وہ لوگوں تک اس کو واضح طریقے سے پہنچا دیں۔ اس سے آگے کفار کے محاسبہ اور ان کے خلاف دار و گیر کا کوئی اختیار ان کو نہیں دیا گیا۔ اس ضمن میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ بات قرآن مجید نے بہت وضاحت سے بیان کی ہے کہ آپ کے ذمے بس اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے اور اس سے آگے کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی:

فَذَكِّرُ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسُتَ عَلَيُهِم بِمُصَيُطِرٍ. (الغاشیہ ۸۸: ۲۱، ۲۲)

''پس تم نصیحت کرتے رہو۔ تمھارا کام بس نصیحت کرنا ہے۔ تمھیں ان کو زبردستی منوانے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔''

وَلَوُ شَاءَ اللّهُ مَا أَشُرَكُواُ وَمَا جَعَلُنَاكَ عَلَيُهِمُ حَفِيُظاً وَمَا أَنتَ عَلَيُهِم بِوَكِيُلٍ. (الانعام ۶: ۱۰۷)

''اور اگر اللہ چاہتا تو یہ شرک نہ کر سکتے۔ اور ہم نے تمھیں ان پر داروغہ نہیں بنایا اور نہ ہی تم پر انھیں منوانے کی ذمہ داری ہے۔''

فَإِنُ أَعُرَضُوا فَمَا أَرُسَلُنَاكَ عَلَيُهِمُ حَفِيُظاً إِنُ عَلَيُكَ إِلَّا الُبَلاَغُ . (الشوریٰ ۴۲: ۴۸)

''پھر اگر یہ منہ موڑیں تو ہم نے تمھیں ان کی دار و گیر کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا۔ تمھارے ذمے تو بس بات کو پہنچا دینا ہے۔''

دوسرا اہم استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اگر کفار کو اسلام قبول نہ کرنے کے جرم میں قتل کر دینے یا سیاسی لحاظ سے مغلوب و محکوم بنانے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو وہ نصوص بے معنی قرار پاتے ہیں جن میں محارب اور غیر محارب کفار

کے مابین امتیاز کرنے اور جو گروہ مسلمانوں کے ساتھ کسی زیادتی کے مرتکب نہ ہوئے ہوں، ان کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ ممتحنہ میں ارشاد ہوا ہے:

لَا يَنۡهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ لَمۡ يُقَاتِلُوكُمۡ فِىۡ الدِّيۡنِ وَلَمۡ يُخۡرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمۡ أَن تَبَرُّوهُمۡ وَتُقۡسِطُوا إِلَيۡهِمۡ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۔ إِنَّمَا يَنۡهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيۡنَ قَاتَلُوكُمۡ فِىۡ الدِّيۡنِ وَأَخۡرَجُوكُم مِّن دِيَارِكُمۡ وَظَاهَرُوا عَلٰى إِخۡرَاجِكُمۡ أَن تَوَلَّوۡهُمۡ وَمَن يَتَوَلَّهُمۡ فَأُوۡلَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ . (الممتحنہ ۶۰: ۸، ۹)

’’جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تمھارے ساتھ لڑائی نہیں کی اور نہ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ تمھیں ان کے ساتھ حسن تعلق اور انصاف کا رویہ اختیار کرنے سے نہیں روکتا۔ اللہ تو انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تو تمھیں صرف ان لوگوں سے دوستی قائم کرنے سے منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے لڑائی کی اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ جو لوگ ان کے ساتھ دوستی گانٹھیں گے، درحقیقت وہی ظالم ہیں۔‘‘

قرآن مجید نے اسی اصول کی توسیع جنگ اور قتال کے دائرے تک کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اگر دشمنوں کا کوئی گروہ اپنی قوم کے سیاسی اور معاشرتی دباؤ کے تحت مسلمانوں کے خلاف میدان جنگ میں تو آ گیا ہو، لیکن لڑائی میں شریک نہ ہو بلکہ مسلمانوں کے ساتھ صلح کا خواہش مند ہو تو اس پر تلوار اٹھانے کا کوئی اختیار اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نہیں دیا ہے:

فَإِنِ اعۡتَزَلُوكُمۡ فَلَمۡ يُقَاتِلُوكُمۡ وَأَلۡقَوۡا إِلَيۡكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمۡ عَلَيۡهِمۡ سَبِيۡلًا . (النساء ۴: ۹۰)

’’پھر اگر وہ گروہ تمھارے مقابلے پر آنے سے گریز کریں اور تم سے نہ لڑیں اور تمھیں صلح کا پیغام دیں تو اللہ نے تمھیں ان کے خلاف اقدام کرنے کا کوئی اختیار نہیں دیا۔‘‘

سورۂ انفال میں ہدایت کی گئی ہے کہ اگر کوئی محارب گروہ بھی صلح اور امن کی پیش کش کرے تو غدر اور نقض عہد کے خدشات کے باوجود اس کی اس پیش کش کو قبول کر لیا جائے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَإِن جَنَحُوا لِلسَّلۡمِ فَاجۡنَحۡ لَهَا وَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۔ وَإِن

’’اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک وہ

يُرِيدُوا أَنْ يَخْدَعُوكَ فَإِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ هُوَ الَّذِىٓ أَيَّدَكَ بِنَصْرِهِ وَبِالْمُؤْمِنِينَ .

(الانفال ۸: ۶۱، ۶۲)

سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ (صلح کا پیغام دے کر) تمھیں دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو اللہ تمھیں کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی مدد سے بھی تمھاری تائید کی اور اہل ایمان کے ذریعے سے بھی۔''

مذکورہ نقطۂ نظر کے استدلال کی وضاحت کے بعد اب ہم اس کا تنقیدی جائزہ لیں گے:

مذکورہ استدلال میں دین کے معاملے میں جبر واکراہ کی نفی اور غیر محارب کفار کے ساتھ مصالحانہ تعلقات کا جواز بیان کرنے والے جن نصوص سے یہ نتیجہ ـــــ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو مشرکین اور اہل کتاب کے خلاف قتال کا جو حکم دیا گیا، اس کی اصل وجہ ان گروہوں کا ایمان نہ لانا نہیں بلکہ فتنہ وفساد اور شر انگیزی تھا ـــــ اخذ کیا گیا ہے، قرآن مجید میں ان کا صحیح محل اور سیاق وسباق اس تعبیر کو قبول کرنے سے مانع ہے۔

ان میں سے پہلے اصول یعنی ایمان کے معاملے میں جبر واکراہ کو لیجیے:

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ عمومی طور پر ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ گروہوں کی تقسیم کے قائم رہنے کو اپنی اسکیم کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور اس ضمن میں اختلاف کا حتمی فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا، تاہم اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی کہ وہ اس دنیا میں حق کے واضح ہونے کے باوجود ایمان نہ لانے والوں کو کوئی سزا نہیں دے گا۔ اس کے برعکس سزا وجزا کا قانون اللہ نے یہ بنایا ہے کہ انسانوں کو ان کے اعمال کا پورا اور کامل بدلہ تو آخرت میں ملے گا، لیکن جزا وسزا کا کچھ نہ کچھ ظہور اس دنیا میں بھی ہوتا ہے اور اس کے تحت افراد یا گروہوں خدا کی پکڑ میں آ جاتے ہیں۔ یہ طریقہ رسولوں کے مخاطبین کے باب میں خاص اہتمام کے ساتھ اختیار کیا جاتا ہے اور جب رسالت کے منصب پر فائز کسی ہستی کے مخاطب اتمام حجت کے بعد اس کے انکار پر مصر رہیں تو ان پر قیامت صغریٰ اسی دنیا میں برپا ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بیان کرتا ہے کہ جب وہ کسی قوم میں اپنے رسول کو مبعوث کرتا ہے تو دلائل وبراہین کی وضاحت اور ایک مخصوص عرصے تک مہلت دیے جانے کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں وہ قوم اسی دنیا میں خدا کے عذاب کی مستحق بن جاتی ہے جو اپنے مقررہ وقت پر لازماً اس قوم پر نازل ہو کر رہتا ہے۔

جہاں تک دین کے معاملے میں جبر واکراہ کی نفی کا تعلق ہے تو قرآن مجید میں یہ بات کہیں بھی اس مفہوم میں نہیں کہی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں کفر کی پاداش میں کسی کو سزا دینے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رکھا۔ قرآن مجید میں

اس بات کا ذکر یا تو تکوینی جبر و اکراہ کی نفی کے پہلو سے ہوا ہے اور یا انسانوں کے دائرۂ اختیار کی تحدید کے لیے۔ پہلے مفہوم کی آیات میں مقصود کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو تمام انسانوں کو تکوینی طور پر صاحب ایمان بنا دیتا، یعنی ان میں سے کسی کو کفر یا ایمان میں سے کسی ایک کے انتخاب کا اختیار ہی حاصل نہ ہوتا۔ قرآن مجید اس کی وجہ یہ بیان کرتا ہے کہ ایمان خدا کی ایک نعمت ہے جو وہ ناقدروں اور اندھوں بہروں کو جبراً نہیں دیتا۔ اس کے مستحق خدا کے قانون کے مطابق وہی لوگ قرار پاتے ہیں جو اپنے دل و دماغ کو قبول حق کے لیے اور اپنی آنکھوں اور کانوں کو خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے کھلا رکھتے ہیں۔ گویا ہدایت اور ایمان کے لیے تکوینی سطح پر جبر و اکراہ کی نفی سے مقصود اہل کفر کے اس دنیا میں سزا اور مواخذہ سے بری ہونے کا بیان نہیں، بلکہ ایمان کی توفیق کا ایک بنیادی شرط یعنی خدا کی دی ہوئی علم و عقل کی صلاحیتوں کے صحیح استعمال سے مشروط ہونے کا بیان ہے۔

قرآن مجید میں یہی بات دوسرے مقامات پر بھی اس طرح وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اس کے مدعا و مفہوم میں کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ سیدنا نوح نے اپنی قوم سے فرمایا:

يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّيَ وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ. (ہود ۱۱: ۲۸)

’’اے میری قوم، دیکھو اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنے پاس سے رحمت عطا کی ہے لیکن تمھاری نگاہیں اس کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں تو کیا ہم اسے زبردستی تمھارے سر تھوپ دیں گے جب کہ تم اس کو پسند نہیں کرتے؟‘

سورۂ یونس میں ارشاد ہوا ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعاً أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ـ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تُؤْمِنَ إِلَّا بِإِذْنِ اللّهِ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ـ قُلِ انظُرُواْ مَاذَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا تُغْنِي الآيَاتُ وَالنُّذُرُ عَن قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُونَ.

’’اور اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین میں جتنے لوگ ہیں، وہ سب کے سب ایمان لے آتے (لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا) تو کیا تم لوگوں پر جبر کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں؟ کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ ایمان لے آئے، مگر اللہ کے اذن سے۔ اور (وہ اس کی توفیق انھی کو دیتا ہے جو اپنی عقل سے کام لیں جبکہ) جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے،

فَهَلُ يَنتَظِرُونَ إِلَّا مِثُلَ أَيَّامِ الَّذِيُنَ خَلَوُا
مِن قَبُلِهِمُ قُلُ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ
الُمُنتَظِرِيُنَ ۔ ثُمَّ نُنَجِّي رُسُلَنَا وَالَّذِيُنَ
آمَنُوا كَذَلِكَ حَقّاً عَلَيُنَا نُنجِ الُمُؤُمِنِيُنَ .
(یونس۱۰: ۹۹۔ ۱۰۲)

ان پر (کفروشرک کی) گندگی مسلط کر دیتا ہے۔ کہہ دو کہ غور کرو ان نشانیوں پر جو آسمانوں اور زمین میں ہیں، لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے، یہ نشانیاں اور عذاب کی دھمکیاں ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتیں۔ پھر کیا یہ بھی (خدا کے عذاب کے) انھی دنوں کا انتظار کر رہے ہیں جو ان سے پہلے گزر جانے والوں پر آئے؟ کہہ دو کہ پس تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔ پھر (جب عذاب آئے گا تو) ہم اپنے رسولوں اور ان پر ایمان لانے والوں کو بچا لیتے ہیں۔ اسی طرح ہو گا۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ایمان لانے والوں کو بچا لیں۔''

یہ درحقیقت زجر و توبیخ کا ایک اسلوب ہے جس کا مقصد استحقاق ہدایت کی اہلیت کا معیار بیان کرنا ہے، نہ کہ اس دنیا میں سزا اور مواخذہ کی نفی۔ ان دونوں باتوں کا محل بالکل الگ الگ ہے اور ان کو نظر انداز کرتے ہوئے محض الفاظ کے ظاہری اشتراک کی بنیاد پر ایک محل کی بات کو دوسرے اور بالکل مختلف محل کی بات سمجھ لینا اسالیب بلاغت سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی استاذ اپنے شاگردوں سے کہے کہ امتحان میں کامیابی حاصل کر کے اگلی جماعت میں ترقی کا مستحق قرار پانے کے لیے ہم کسی سے جبراً محنت نہیں کروائیں گے، بلکہ جو طالب علم خود اپنے شوق اور لگن سے اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرے گا، ترقی بھی اسی کا حق ہو گی، اور اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا جائے کہ استاذ صاحب امتحان میں ناکام ہونے والوں کے لیے مواخذہ اور دارو گیر سے بری ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ استنتاج بالکل بے محل ہو گا، چنانچہ سورۂ یونس کی جو آیات ہم نے اوپر نقل کی ہیں، ان میں قرآن مجید نے 'ولو شاء ربك لآمن من في الارض كلهم جميعا' سے تکوینی عدم اکراہ کو بیان کیا ہے، لیکن اس کے بعد 'فهل ينتظرون الا مثل ايام الذين خلوا من قبلهم' سے منکرین حق کے مواخذہ کے قانون کا بھی ذکر کیا ہے اور اس طرح یہ واضح کر دیا ہے کہ جبر و اکراہ کی نفی سے اس کی مراد درحقیقت کیا ہے۔[1]

---

[1] البتہ 'لا اكراه في الدين' اور اس کے ہم معنی نصوص سے، جو اصلاً تکوینی جبر و اکراہ کی نفی کے بیان کے لیے آئی ہیں، التزامی طور پر یہ استدلال یقیناً درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت کے بغیر کسی انسان کو دین کے معاملے میں کسی

دوسرے انسان پر جبر واکراہ کا حق حاصل نہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں اس آیت کی جو شان نزول بیان ہوئی ہے، اس سے آیت سے اخذ ہونے والے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ انصار میں یہ رواج تھا کہ اگر کسی عورت کے بچے پیدایش کے بعد فوت ہو جاتے تو وہ منت مان لیتی کہ اگر میرا کوئی بچہ زندہ رہا تو میں اسے یہودی مذہب کا پیروکار بناؤں گی۔ اس طرح انصار کے کئی بچے یہودیوں کی سرپرستی میں رہتے تھے۔ جب بنونضیر کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تو انصار نے کہا کہ ہم اپنے بچوں کو ان کے ساتھ نہیں جانے دیں گے۔ ہم نے تو ان کو اس وقت یہودی مذہب کا پیروکار بنایا تھا جب ہم سمجھتے تھے کہ ان کا دین ہمارے دین سے بہتر ہے۔ اب جب اسلام آ چکا ہے تو ہم انھیں اسلام کی پیروی پر مجبور کریں گے۔ اس پر قرآن مجید میں لا اکراہ فی الدین کا حکم نازل ہوا اور کہا گیا کہ ان میں سے جو یہودیوں کے ساتھ جانا چاہے، چلا جائے اور جو یہودی مذہب چھوڑ کر وہیں رہنا چاہے، رہ جائے۔ (تفسیر الطبری ۳/۱۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بعض مواقع پر اسی تناظر میں اس آیت کا حوالہ دینا منقول ہے۔ روایت ہے کہ جب ابو الحصین انصاری کے دو بیٹے نصرانی ہو کر شام چلے گئے تو انھوں نے یہ معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گوش گزار کیا اور کہا کہ آپ ان کو پیغام دے کر واپس بلوائیں۔ آپ نے فرمایا: لا اکراہ فی الدین۔ (الاصابہ، ترجمہ ابوحصین الانصاری، ۱/۲۳۳، ۳/۳۰۸۔ اسد الغابہ، ۳/۱۶۰)

'طبقات المحدثین باصبہان' کے مصنف عبداللہ بن محمد بن جعفر انصاری کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا سلمان فارسیؓ کی درخواست پر ان کے اہل خاندان کے نام جو امان نامہ لکھوایا، اس میں فرمایا کہ:

من آمن باللہ وبرسلہ کان لہ فی الآخرۃ ترعۃ الفائزین ومن اقام علی دینہ ترکناہ ولا اکراہ فی الدین (طبقات المحدثین باصبہان ۱/۲۳۲)

بعض آثار میں سیدنا عمر سے بھی آیت کو اس مفہوم پر محمول کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً ان کے غلام وسق بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر نے مجھے اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی، لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین۔ پھر جب ان کی وفات کا وقت قریب آ گیا تو انھوں نے مجھے آزاد کر دیا۔ (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۶/۱۵۸۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۵۵۰) ایک موقع پر انھوں نے ایک معمر مسیحی خاتون کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ کیا میں موت کے قریب پہنچ کر اپنا مذہب چھوڑ دوں؟ اس پر سیدنا عمر نے فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین۔ (نحاس، الناسخ والمنسوخ ۱/۱۹۱)

اسی طرح شام کی فتوحات میں مسلمانوں کے جرنیل عیاض بن غنم نے مریم الداریۃ کے نام خط میں لکھا:

یہی صورت حال ان آیات کی ہے جہاں عدم اکراہ کا اصول انسانوں کے دائرۂ اختیار کو بیان کرنے کے لیے بیان کیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا گیا ہے کہ آپ کو کفار پر داروغہ بنا کر مسلط نہیں کیا گیا۔ ان میں سے کم وبیش ہر مقام پر یہ واضح کیا گیا ہے کہ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینے کے بعد انھیں اس کو قبول کرنے پر مجبور کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا بھی غیر مبہم اعلان کر دیا گیا کہ انکار حق پر اللہ تعالیٰ ان کافروں کا محاسبہ لازماً کریں گے:

رَبُّكُمُ أَعُلَمُ بِكُمُ إِنُ يَّشَأُ يَرُحَمُكُمُ أَوُ إِنُ يَّشَأُ يُعَذِّبُكُمُ وَمَا أَرُسَلُنَاكَ عَلَيُهِمُ وَكِيُلًا. (بنی اسرائیل ۱۷: ۵۴)

''تمھارا رب تمھارے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو تم پر رحمت کرے گا اور چاہے گا تو تمھیں سزا دے گا۔ اور (اے پیغمبر) ہم نے تمھیں ان پر مسلط کر کے نہیں بھیجا۔''

وَإِن مَّا نُرِيَنَّكَ بَعُضَ الَّذِىُ نَعِدُهُمُ أَوُ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيُكَ الُبَلاَغُ وَعَلَيُنَا الُحِسَاب. (الرعد ۱۳: ۴۰)

''اور چاہے ہم تمھیں اس عذاب کی ایک جھلک دکھا دیں جس کی ہم انھیں دھمکی دیتے ہیں یا تمھیں وفات دے دیں، تمھارے ذمے بس پہنچا دینا ہے اور محاسبہ کرنا ہمارے ذمے ہے۔''

أَفَأَنتَ تُسُمِعُ الصُّمَّ أَوُ تَهُدِىُ الُعُمُىَ وَمَن كَانَ فِىُ ضَلَالٍ مُّبِيُنٍ ـ فَإِمَّا نَذُهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنُهُم مُّنتَقِمُونَ ـ أَوُ نُرِيَنَّكَ الَّذِىُ وَعَدُنَاهُمُ فَإِنَّا عَلَيُهِم مُّقُتَدِرُونَ. (الزخرف ۴۳: ۴۰، ۴۲)

''تو کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو یا اندھوں کو اور ان لوگوں کو راہ دکھا سکتے ہو جو کھلی گمراہی میں پڑے ہوئے ہوں؟ پھر اگر ہم تمھیں لے جائیں گے تو یقیناً ہم ان سے انتقام لیں گے۔ یا اگر تمھیں وہ عذاب دکھانا چاہیں گے جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے تو بے شک ہمیں ان پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔''

آیات سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو تو یہ حق نہیں دیا کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اس کے

ولسنا نکرھك علی فراق دینك ولا احدا من اھل بلدتك قال اللہ تعالیٰ لا اکراہ فی الدین (واقدی، فتوح الشام ۱/ ۳۷۶)

''ہم تمھیں یا تمھارے شہر کے لوگوں میں سے کسی کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں۔''

اختیار کردہ مذہب سے بزورِ قوت برگشتہ کرنے کی کوشش کرے یا اس پر اسے سزا دے، لیکن اللہ تعالیٰ یہ اختیار رکھتے ہیں کہ وہ اتمام حجت کے بعد بھی دین حق کو قبول نہ کرنے والوں کو سزا دیں۔

تکوینی طور پر انسانوں کو ابتداءً ایمان پر مجبور نہ کرنا اور پھر وضوح حق کے بعد ایمان نہ لانے پر انھیں سزا کا مستحق قرار دینا، یہ دونوں اصول عدل وحکمت پر مبنی ہیں اور ان میں باہم کوئی منافات نہیں۔ چونکہ انسان کو اس دنیا میں بھیجنے سے اس کا امتحان اور آزمایش مقصود ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تکوینی طور پر اس بات پر مجبور نہیں کیا کہ وہ اس پر ایمان لائیں، بلکہ انھیں اپنے اختیار اور ارادے سے ایمان یا کفر میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی آزادی دی ہے۔ اس امتحان وآزمایش کے بامعنی اور منصفانہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ دارالامتحان میں انسانوں کو کوئی بھی عقیدہ وعمل اختیار کرنے کی آزادی ہو اور انھیں بالجبر کسی نقطۂ نظر سے برگشتہ کرنے یا کسی مخصوص عقیدہ ومذہب کو اختیار کرنے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ تاہم اس سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ اس دنیا میں انسانوں کے مواخذہ ومحاسبہ کا امکان ہی ختم ہو جائے، اس لیے کہ عدم اکراہ کا اصول جزا وسزا کے قانون کی نفی کے لیے نہیں، بلکہ اس جزا وسزا کو ایک معقول اور اخلاقی اصول بنانے کے لیے درکار ارادہ واختیار کی آزادی کی شرط کو یقینی بنانے کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرکشی اور عناد کی صورت میں اس سے باز پرس کا کوئی اختیار ہی اپنے پاس نہیں رکھا اور اسے ایک شتر بے مہار بنا کر دنیا میں بھیج دیا ہے، بلکہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں پر اپنے فضل واحسان اور نقمت وعذاب کا فیصلہ تحکم کے طریقے پر نہیں، بلکہ عدل وانصاف کے مطابق امتحان اور آزمایش کے اصول پر کرتا ہے۔ غور کیجیے تو خدائی قانون کے یہ دونوں پہلو باہم بالکل متوافق اور ایک ہی مقصد کو پورا کرنے کے لیے خدا کی اسکیم کا حصہ ہیں، اس لیے کہ آزادی دیے بغیر انسان کو امتحان میں ڈالنا تو یقیناً غیر معقول ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کسی فرد یا گروہ کو قبول حق کے معاملے میں تکوینی طور پر مجبور نہیں کیا، لیکن ظاہر ہے کہ ارادہ واختیار کی یہ آزادی مطلق نہیں بلکہ محدود ہے، چنانچہ اس آزادی کے غلط استعمال پر اس کی جزا وسزا کا فیصلہ کرنا کسی طرح بھی اس کے منافی نہیں اور اتمام حجت کے بعد انکار کرنے والوں کو سزا دینا نہ صرف خالق کائنات کا حق بلکہ اس کے قانون عدل وانصاف کا لازمی تقاضا ہے۔

زیر بحث زاویۂ نگاہ کی غلطی یہ ہے کہ جن آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کے معاملے میں تکوینی جبر کی نفی کی ہے، وہ انھیں خدا کے قانونی اختیار کی نفی پر محمول کرتا اور ان سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان قبول نہ کرنے پر کسی کو سزا بھی نہیں دے سکتے۔ اسی طرح یہ زاویۂ نگاہ اس دائرۂ اختیار میں جو خدا کو انسانوں پر حاصل ہے اور اس دائرۂ

اختیار میں جو انسانوں کو انسانوں کے بارے میں دیا گیا ہے، فرق کو ملحوظ نہیں رکھتا اور ایک اخلاقی پابندی جو درحقیقت انسانوں کے لیے بیان کی گئی ہیں، اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لیے بھی انھی کی پابندی لازم کر رکھی ہے اور وہ ان کے خلاف نہ کوئی فیصلہ کر سکتا ہے اور نہ کوئی حکم دے سکتا ہے، حالانکہ قرآن مجید کے نصوص میں انبیا کی قوموں کے مواخذہ اور ان پر عذاب الٰہی نازل کیے جانے کا قانون بار بار اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے کسی قوم میں پیغمبر کی بعثت محض ایک داعی حق کی بعثت نہیں ہوتی، بلکہ اس قوم کے لیے فیصلے کی گھڑی ہوتی ہے اور پیغمبر کے مبعوث ہونے کے بعد قوم کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں: یا تو وہ پیغمبر کے دعوے کی تصدیق کرتے ہوئے اس پر ایمان لا کر نجات پائے اور یا اس کے دعوے کو تسلیم نہ کرے اور خدا کے عذاب کا نشانہ بن جائے۔ ارشاد ہوا ہے:

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ فَإِذَا جَاءَ رَسُولُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ. (یونس ۱۰: ۴۷)

''ہر گروہ میں ایک رسول بھیجا گیا۔ پھر جب ان کا رسول آ گیا تو ان کے مابین بالکل انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا گیا اور ان پر کوئی زیادتی نہیں کی گئی۔''

اس ضمن میں ایک شبہ یہ بھی پایا جاتا ہے کہ انبیا کی قوموں پر عذاب نازل ہونے کی وجہ محض ان کا ایمان نہ لانا نہیں بلکہ انبیا اور ان کی پیروی اختیار کرنے والے اہل ایمان کو اذیتیں اور تکالیف پہنچانا تھا، تاہم قرآن مجید کے بیانات سے اس مفروضے کی تائید نہیں ہوتی۔ اس میں شبہ نہیں کہ انبیا کی قوموں نے بالعموم اپنے رسولوں کو محض جھٹلا دینے پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ انھیں اور ان کے پیروکاروں کو ایذا رسانی اور تعذیب کا نشانہ بھی بنایا جو ان کے جرم کو زیادہ سنگین اور قابل مواخذہ بنا دیتا ہے، تاہم قرآن مجید میں رسولوں کے انذار کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس سے واضح ہے کہ رسولوں پر ان قوموں کو ایمان لانے کی دعوت دی اور نفس انکار و تکذیب پر انھیں خدا کے عذاب کی وعید سنائی:

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُهُ بَيَاتاً أَوْ نَهَاراً مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُونَ ـ أَثُمَّ إِذَا مَا وَقَعَ آمَنتُم بِهِ آلآنَ وَقَدْ كُنتُم بِهِ تَسْتَعْجِلُونَ. (یونس ۱۰: ۵۰، ۵۱)

''کہہ دو کہ تم بتاؤ اگر اللہ کا عذاب تم پر رات کو سوتے میں یا دن کو آ گیا تو وہ کیا چیز ہے جس کی ان مجرموں کو جلدی ہے؟ کیا پھر جب وہ عذاب آن پڑے گا تو تب تم ایمان لاؤ گے؟ کیا اب (ایمان لاتے ہو) جبکہ تم تو اس عذاب کے جلد آنے کا مطالبہ کر رہے تھے؟''

انعام میں ہے:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنذِرِيْنَ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُوْنَ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُواْ بِآيَاتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُواْ يَفْسُقُوْنَ. (الانعام۶: ۴۸، ۴۹)

''اور ہم رسولوں کو اسی لیے بھیجتے ہیں کہ وہ بشارت دیں اور انذار کریں۔ پھر جو لوگ ایمان لے آئے اور (اپنے اعمال کو) درست کر لیا، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم زدہ ہوں گے۔ لیکن جو ہماری آیات کو جھٹلائیں، ان کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب آ لیتا ہے۔''

سورۂ فاطر میں فرمایا:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيْراً وَنَذِيْراً وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ـ وَإِن يُكَذِّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ جَاءتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالزُّبُرِ وَبِالْكِتَابِ الْمُنِيْرِ ـ ثُمَّ أَخَذْتُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ.

(فاطر۳۵: ۲۴-۲۶)

''ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بھیجا، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور کوئی گروہ ایسا نہیں جس میں کوئی آ گاہ کرنے والا نہ گزرا ہو۔ اور اگر یہ لوگ تمھیں جھٹلاتے ہیں تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی (پیغمبروں کو) جھٹلایا۔ ان کے پاس بھی ان کے رسول واضح دلائل اور صحائف اور ایک روشن کتاب لے کر آئے تھے۔ پھر میں نے کفر کرنے والوں کو پکڑا تو کیسی تھی میری سزا!''

قرآن مجید سے یہ بھی واضح ہے کہ اگرچہ پیغمبر کی تکذیب، اس کی دعوت کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے اور اہل ایمان کو تعذیب و ایذا کا نشانہ بنانے والے اصلاً قوم کے سردار اور بارسوخ لوگ ہوتے تھے، لیکن جب خدا کا عذاب آیا تو قوم کے صرف وہی افراد اس سے نجات پا سکے جو پیغمبر پر ایمان لا کر اس کا ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ سیدنا نوح کی قوم کے معدودے چند افراد کے سوا ساری قوم طوفان میں غرق ہو گئی، حتیٰ کہ خود ان کی اپنی بیوی اور بیٹا بھی اس سے بچ نہ سکے۔ (ہود۱۱: ۴۲، ۴۳۔ التحریم۶۶: ۱۰)

قرآن نے ان قوموں کے بحیثیت قوم عذاب کا نشانہ بننے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ انھوں نے پیغمبر کی پیروی اختیار کرنے کے بجائے اپنی قوم کے سرکش جباروں کی بات مانی اور ان کی پیروی میں پیغمبر اور اس لائی ہوئی نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ قوم عاد کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُواْ بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْاْ رُسُلَهُ وَاتَّبَعُواْ أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ وَأُتْبِعُوا فِي هَـذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ أَلا إِنَّ عَاداً كَفَرُوا رَبَّهُمْ أَلاَ بُعْداً لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ. (ہود۱۱: ۵۸،۶۰)

''اور یہ عاد کے لوگ تھے جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کا انکار کیا اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر ہٹ دھرم جبار کے طریقے کی پیروی کی۔ ان پر اس دنیا میں بھی لعنت مسلط کی گئی اور آخرت میں بھی۔ سنو، عاد نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ سنو، ہود کی قوم عاد کے لیے بربادی مقدر ہوئی۔''

قرآن نے ان قوموں کی بربادی کی وجہ ان کا ایمان نہ لانا ہی بیان کی ہے:

وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِن قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُواْ وَجَاءتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُواْ لِيُؤْمِنُواْ كَذَلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ. (یونس۱۰: ۱۳)

''اور یقیناً ہم نے تم سے پہلی قوموں کو بھی ہلاک کیا جب انھوں نے ظلم کیا۔ ان کے پاس ان کے رسول واضح دلائل لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اسی طرح ہم مجرم قوموں کو سزا دیا کرتے ہیں۔''

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ انبیا کے منکرین جب ان کی طرف سے پیش کردہ دلائل و براہین پر غور کرنے سے گریز کرتے اور محض ہٹ دھرمی کی بنا پر ان کی تکذیب کا رویہ اختیار کیے رکھتے ہیں تو ایک خاص وقت تک آزمانے کے بعد اللہ تعالیٰ ان سے ایمان کی توفیق ہی سرے سے سلب کر لیتے ہیں اور خدا کے اس فیصلے کے بعد ہر قسم کی نشانیوں کو دیکھنے کے باوجود انھیں ایمان لانا نصیب نہیں ہوتا۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَتُ رَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ ۔ وَلَوْ جَاءَتْهُمْ كُلُّ آيَةٍ حَتَّى يَرَوُا الْعَذَابَ الأَلِيمَ. (یونس۱۰: ۹۶-۹۷)

''بے شک وہ لوگ جن پر تیرے رب کا فیصلہ لازم ہو جائے، چاہے ان کے پاس ہر نشانی آ جائے، وہ اس وقت تک ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوتے جب تک کہ دردناک عذاب کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیں۔''

اسی بنیاد پر جب انبیا اپنی مخاطب قوموں کے ایمان سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے خدا سے دعا کی کہ اب وہ ایمان کی توفیق سے محروم کر دے تاکہ خدا کے عذاب کا فیصلہ ان پر نافذ ہو جائے۔ چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی کہ:

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَى أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَى قُلُوبِهِمْ فَلاَ يُؤْمِنُواْ حَتَّى يَرَوُاْ الْعَذَابَ الأَلِيمَ. (یونس ۱۰:۸۸)

''اے ہمارے رب، ان کے اموال کو تباہ کر دے اور ان کے دلوں پر مہر لگا دے تاکہ جب تک یہ دردناک عذاب کو سامنے نہ پا لیں، ایمان نہ لانے پائیں۔''

سیدنا نوح نے بددعا کی کہ:

رَّبِّ إِنَّهُمْ عَصَوْنِي وَاتَّبَعُوا مَن لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهُ وَوَلَدُهُ إِلَّا خَسَاراً .... وَقَدْ أَضَلُّوا كَثِيراً وَلَا تَزِدِ الظَّالِمِينَ إِلَّا ضَلَالاً. (نوح ۷۱:۲۱۔۲۴)

''اے میرے رب، انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی پیروی اختیار کی جن کے مال اور اولاد نے ان کے گھاٹے میں ہی اضافہ کیا ہے۔ ..... انھوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اور تو ان ظالموں کی گمراہی میں ہی اضافہ فرمانا۔''

قرآن نے اس ضمن میں انبیا کی قوموں کے علاوہ خود ان کے افراد خانہ کے حوالے سے بھی اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی وضاحت فرمائی ہے۔ چنانچہ سیدنا نوح کا ایک بیٹا اہل ایمان کے ساتھ کشتی میں سوار نہ ہونے پر خود اپنے والد کے سامنے طوفان کے عذاب کا شکار ہو گیا اور سیدنا نوح نے جب اس پر بارگاہ الٰہی میں شکوہ کیا تو انھیں تنبیہ کی گئی کہ ایمان نہ لانے کے باعث وہ بھی خدا کے عذاب کا مستحق تھا، اس لیے وہ پدرانہ شفقت سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ سے کوئی ناروا مطالبہ نہ کریں:

قَالَ يَا نُوحُ إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلاَ تَسْأَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنِّي أَعِظُكَ أَن تَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ. (ہود ۱۱:۴۶)

''اللہ نے فرمایا کہ اے نوح، وہ تمھارے اہل میں سے نہیں تھا۔ اس کے عمل نیک نہیں تھے۔ سو تو مجھ سے اس چیز کا سوال نہ کر جس کا تجھے علم نہیں۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ ہو جا۔''

سیدنا لوط کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی قوم پر خدا کا عذاب آنے سے پہلے اپنے اہل خانہ کو لے کر رات کے اندھیرے میں اپنی بستی سے نکل جائیں تو ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی گئی کہ وہ اپنی بیوی کا ساتھ لے کر نہ جائیں، کیونکہ ایمان نہ لانے کی وجہ سے وہ بھی خدا کے عذاب کی مستحق ہے اور اسی انجام کا شکار ہو گی جو ان کی قوم کے لیے مقدر کیا جا چکا ہے:

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَلاَ يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ إِلاَّ امْرَأَتَكَ إِنَّهُ مُصِيبُهَا مَا أَصَابَهُمْ. (ہود ۱۱:۸۱)

''اپنے گھر والوں کو لے کر رات کے کسی پہر میں روانہ ہو جا اور تم میں سے کوئی پلٹ کر پیچھے نہ دیکھے۔ ہاں، اپنی بیوی کو ساتھ نہ لے جانا۔ بے شک اس پر

بھی وہی عذاب آئے گا جو پوری قوم پر آنے والا ہے۔‘‘

قرآن مجید کے نزدیک ان قوموں کا اصل جرم خدا کی آیات پر غور نہ کرنا اور خدا کی دی ہوئی علم وعقل کی صلاحیتوں کو استعمال نہ کرنا ہے۔ قرآن نے یہ بات غیر مبہم انداز میں واضح کی ہے کہ انبیا کی یہ قومیں جس جرم کی وجہ سے اصلاً عذاب کی مستحق قرار پائیں، وہ یہ تھا کہ انھوں نے انبیا و رسل کی دعوت اور ان کے پیش کردہ دلائل و بینات پر غور نہیں کیا اور نتیجتاً ان پر ایمان لانے کے بجائے ان کی تکذیب پر مصر رہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولاً أَنِ اعْبُدُواْ اللّهَ وَاجْتَنِبُواْ الطَّاغُوتَ فَمِنْهُم مَّنْ هَدَى اللّهُ وَمِنْهُم مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلالَةُ فَسِيرُواْ فِي الأَرْضِ فَانظُرُواْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ. (النحل ۱۶: ۳۶)

’’اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ سو ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جنھیں اللہ نے ہدایت دی اور کچھ وہ تھے جن پر گمراہی مسلط ہوگئی۔ تو تم زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟‘‘

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ. وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ وَأَصْحَابُ الْأَيْكَةِ أُوْلَئِكَ الْأَحْزَابُ. إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ. (ص ۳۸: ۱۲-۱۴)

’’ان سے پہلے قوم نوح اور قوم عاد اور میخوں والے فرعون اور قوم ثمود اور قوم لوط اور جنگل والوں نے بھی (پیغمبروں کو) جھٹلایا۔ یہی ہیں (منکروں) کے گروہ۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا جس پر میرا عذاب ان پر مسلط ہو گیا۔‘‘

سیدنا نوح نے اپنی قوم کے بارے میں فرمایا:

رَبِّ إِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُونِ. فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحاً وَنَجِّنِيْ وَمَن مَّعِيَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ. (الشعراء ۲۶: ۱۱۷، ۱۱۸)

’’اے میرے رب، بے شک میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا ہے۔ سو تو میرے اور ان کے درمیان واضح فیصلہ فرما دے اور مجھے اور میرے ساتھ جو اہل ایمان ہیں، انھیں (اپنے عذاب سے) بچا لے۔‘‘

فرعون اور آل فرعون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فَلَمَّا جَاءتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَذَا

’’پھر جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں آئیں

سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۔ وَجَحَدُوا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَا أَنفُسُھُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً فَانظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُفْسِدِیْنَ. (النمل ۲۷: ۱۳-۱۴)

تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ انھوں نے ظلم اور سرکشی سے کام لیتے ہوئے ان نشانیوں کو جھٹلا دیا حالانکہ ان کے دل ان کا یقین کر چکے تھے۔ سو دیکھو کہ مفسدین کا انجام کیسا ہوا۔''

یہی بات 'فَکَذَّبُوْہُ فَأَھْلَکْنَاھُمْ' اور 'فَکَذَّبُوْہُ فَأَخَذَھُمْ عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّۃِ' کے الفاظ میں قوم عاد اور قوم شعیب کے بارے میں بیان ہوئی ہے۔ (الشعراء ۲۶: ۱۳۹، ۱۸۹)

[باقی]